

**PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY**

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222181

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۶۳۳۳ Accession No. ۹۶۰۲

Author: رشید النعمانی ر - ج

Title:

جوہرِ اہلبیت

This book should be returned on or before the last marked below.



مصور غمِ نازتِ علامہ راشد الخیری مدظلہ کی نہایت مشہور کتاب میں

حیاتِ صالحہ سے پہلی تصنیف جس کی یا صالحاتِ علامہ محترم کی

جاوید نگار مصنف کے کمالِ شانہ نگار کی کامیابی کا شہرہ ہر

کے وہ تمام واقعات نہایت ہی مؤثر پیرایہ میں بیان کئے

نارہ سے معلوم ہوگا کہ وہی باپ خواہ لاد کا عاشق

ہاں کس طرح سوکن کے بچوں کی مٹی پلید کوئی ہے

مصائب کا کیسے کیسے ایشار اور قربانیوں سے مقابلہ

میں آج سے چالیس سال پہلے کے گھرانہ

طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ سطر تحریر کیا گیا

وہاں دہی قلمی کی جگہ تھی۔ کوثر سے دہلی ہوئی

ہندوستانی دباؤں میں استقامت کے مطلب کے

ام ایل ایل بی حیاتِ صالحہ پر تنقید کرتے ہوئے

اس پہلی ہی کتاب میں مولانا نے قلم ڈال دیا کہ کتاب

تیر و نشر کا کام کرتا ہے نہایت (عظیم) علاوہ محصول

نے کاپی :- منیر عصمت کو چہ چیلان دہلی

سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر ۷۴

بزمِ آخسر

المعروف بہ

جوہرِ قدامت

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ
نے

۱۹۸۷ء میں تصنیف فرمایا

اور

جنوری ۱۹۸۲ء میں نظر ثانی فرمائی

عصمت بک ایجنسی دہلی

محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپی
ایک روپہ آٹھ آنے

قیمت ۱۔

Checked 1978

فہرست

باب	صفحہ	باب	صفحہ
پہلا باب	۵	سولہواں باب	۱۱۰
دوسرا باب	۷	سترہواں باب	۱۱۵
تیسرا باب	۱۷	اٹھارہواں باب	۱۲۵
چوتھا باب	۲۹	انیسواں باب	۱۳۳
پانچواں باب	۳۹	بیسواں باب	۱۳۳
چھٹا باب	۴۲	اکیسواں باب	۱۴۱
ساتواں باب	۴۶	بائیسواں باب	۱۵۵
آٹھواں باب	۵۷	تیسواں باب	۱۶۳
نواں باب	۶۲	چوبیسواں باب	۱۷۲
دسواں باب	۷۵	پچیسواں باب	۱۸۰
گیارہواں باب	۷۸	چھبیسواں باب	۱۸۲
بارہواں باب	۸۰	ستائیسواں باب	۱۸۶
تیرہواں باب	۹۰	اٹھائیسواں باب	۱۸۹
چودھواں باب	۹۷	اقتیسواں باب	۱۹۰
پندرہواں باب	۱۰۱		

Checked 1969.

Checked 1969

طالع و نسیبہ

جوہر قدامت کا نئی اشاعت صوفی کہنی سے میں واپس لے چکا
ہوں اور اب اس کے طالع و نسیبہ نام محفوظ ہیں۔ اس کے
کوئی صاحب اس کے کل یا جزو کو مشاع فرمانے کا قصد نہ فرمائیں۔ ورنہ
قانونی و اخلاقی کٹاؤں کے منہمک ہو گئے اور انہیں بہت برا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔
مکہ لہتہ تاجران کتب بسطدار جلدیں چاہیں معقول کمیشن پر دفتر عصمت دہلی سے
طلب کر سکتے ہیں۔

رازق انجیری
الک عصمت بک انجینی دہلی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۱

۱۱

یہاں خاک میں بکھر گئے تھے

نواب نصیر الدین احمد کی ہڈیاں مدتیں ہوئیں خاک ہو چکیں۔ مگر ابھی انکی آنکھیں
 دیکھنے والے لوگ ہزار پانسو نہیں تو دو چار زندہ ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مرنے والا
 نصیر کس آن کا آدمی اور کس شان کا مسلمان تھا۔ دولت تھی۔ ثروت تھی حکومت
 تھی۔ امارت تھی۔ مگر سخت یا غرور کبھی پاس اگر نہ پھٹکا۔ بائیس سال سے اوپر عمر پائی۔
 پوٹھول کا رئیس۔ خراج کا غنی۔ دل کا شیر۔ روپے کے ڈھیر تھے۔ دولت کی افراط
 تھی۔ حویلی مکان جامدا و املاک انڈیا کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر جس سے ملا جھک کر اور
 جس سے بولا نہیں کر۔ دونوں وقت لنگر عام تھا۔ جس میں مرتے دم تک فرق
 نہ آیا۔ غریب غریب ایااج۔ فقیر ایک نصیر کے دسترخوان سے سینکڑوں
 بندگان خدا پل رہے تھے۔ پھر یہ نہیں کہ کرم اور احسان۔ جس کو دیا اور جب
 دیا منت سے اور خوشاد سے۔ بجز کی یہ کیفیت کہ غریب پوس بول
 کے گھر خود جاتا اور کھانا دیتا۔ خلق کا یہ حال کہ سال کا سوال کبھی رد کیا نہ کرنے کا
 خیال آیا۔ اس دولت پر اور اس ثروت پر گرمی کے تیسوں روز سے دس ہو یا پڑیں
 اور تندرست ہو یا بیمار ممکن نہیں کہ تانہ ہوں۔ جاڑوں کی نماز فجر کو کوئی سروبی
 ہو یا چلے کے دن ناممکن تھا کہ جماعت سے نہ پڑھے۔ مرموم مرچکا۔
 نصیری مسجد اور احمدی امام باڑا آج تک اس کے کام اور اس کا نام

روشن کر رہے ہیں۔ آدمی کیا ایک دریا اور مسلمان کیا ایک چشہ تھا۔ جس کا فیض صبح سے شام اور خاص سے عام تک جاری تھا۔ تیمم اس کے در سے رائیں اس کے گھر سے اپانج اس کی دولت سے مسکین اس کی ثروت سے زندہ تھے اور خوش تھے۔ یہ بھی وجہ، یہ تھا سبب اور یہ تھا باعث کہ اس کے جنازے پر بڑھوں نے پچھڑیں کھائیں۔ جوانوں نے سر پھوڑے اور بچوں نے داویلا مچائی۔ اب یہ اتفاق سے تعبیر کر دیا تقدیر سے کہ شہر بھر کے علاج اور دنیا بھر کے جتن کر ڈالے مگر کچھ نہ ہوا۔ اور بیوی بد نصیب اسی رنج میں گھل گھل کر تمام ہوئی۔ یہ خیال کہ نصیر کی عمر اب نکاح کی نہ تھی درست نہیں۔ مرد ساٹھا اور باٹھا۔ عورت بیسی اور کھنسی۔ رو پیہ تھا۔ اطمینان تھا۔ بے فکری تھی۔ خوشحالی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ غریب بقیہ عمر ٹسروں ٹوں بسر کرتا۔ ہاں جس بات پر اعتراض ہو سکتا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ راز نہیں۔ بات کھلی اور معاملہ صاف اور حق یہ ہے کہ بنائے فساد جس نے برباد کیا یہ ہی ہے۔ نکاح کرتا۔ شوق سے کرتا۔ ایک نہیں دو کرتا۔ چالیس کیا ساٹھ برس کی عمر میں کرتا۔ مگر بات سمجھ کر اور موقع دیکھ کر بیٹیوں کی کمی نہ تھی۔ کواری سے کواری اور بہتر سے بہتر لوگ بیٹی دیتے اور چوم چاٹ کر دیتے۔ کواری نہ ہوتی رائیں ہوتی۔ امیر نہ ہوتی۔ فقیر ہوتی۔ مگر ہڈی کی اچھی اور خون کی پٹی۔ گھر کی مغلائی اور مغلائی بھی وہ جس کی ماکہڑے سیتے سیتے۔ اور نانی پانی ڈھونڈے ڈھونڈے مری۔ شکل کی کیسی ہی اعلیٰ اور صورت کی کتنی ہی افضل کیوں نہ ہو۔ مگر حیثیت بھی ایک چیز ہے۔ نواب کی یہ غلطی جو مغلائی سے نکاح کی صورت میں ظاہر ہوئی اتنی سنگین نہ ہو کہ اس پر الزام آ سکے۔ مگر یہ خیال بھی کچھ نہ کچھ وقعت رکھتا ہی ہے کہ اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں۔ لاکھ راجا کے گھر آئی اور رانی کہلائی۔ لیکن ہم تو یہ ہی سمجھیں گے اور

سمجھتے ہیں کہ اگر نصیر اصرار کرتا تو بساندی بوٹی کا گندہ شور بہ نہ ہوتا۔
اولاد کا رنج فقط بیگم صاحب کی تقدیر میں تھا! اسکے بعد تو مغلانی کی
گود میں پہلے ہی سال چلتا ہوا لال تھا۔ افسوس یہ ہے کہ نصیر کو بہار دیکھتی نصیب
نہ ہوئی۔ ضمیر چار ہی سال کا تھا کہ وہ رخصت ہوئے اور اس تمام اثاثہ کی مالک
بی مغلانی ہوئیں۔

دوسرا باب

کہاں پندرہ بیس روپے ماہوار کی مغلانی اور کچا چار پانچ لاکھ روپے
کا تعلقہ بلا شرکت غیرے اس اکیلی کی ملکیت یا قبضہ میں تھا۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا
سیر پڑا۔ وہ بڑھ بڑھ کر بولتی اور چڑھ چڑھ کر کہتی کہ سننے والے بھی نوک رہ جاتے
مغلانی سے گھروالی ہوئی۔ گھروالی سے راج دلا ری۔ جو کچھ کرتی ٹھیک اور جو کچھ نہ کرتی
عوڑا۔ اس پر ہوئی اولاد اور اولاد بھی بھاری پتھر نہیں چکدار سیرا۔ سنائی جو چاہتی
ور کھتی جو جی میں آتا۔ مغاسی بڑی بلا ہے اور عرض اس سے بدتر ٹھکانا۔ عزیز اور عزیز
بشتے دار سنتے جو کہتی۔ اور اٹھاتے جو ڈالتی۔ دولت سب سے بڑی عیب
ہے اچھی اچھی سیرانیاں اور بڑی بڑی منغل ترا دیاں اس کے اشارے پر آنکھیں
ب۔ خدا کی شان تھی الف کے نام بے نہ آئے۔ مگر جلسہ میں سب سے
لے۔ اور کلب میں سب سے پہلے صورت تو اچھی تھی ہی اب لباس
کسی سے کم کیا بہتر ہی تھا۔ دھوم مچ گئی۔ سایہ بھی اور بوٹ بھی۔
ری بھی اور سوٹ بھی۔ وہی وہ تھی۔ مگر وہ جو بچپن کے لئے سنائے
پارکے اور انی سیدھی ایک آدمہ آیت یاد تھی اس کا بھی کبھی نہ کبھی
ہی جاتا تھا۔ روزانہ تو نہیں اور بچکانہ بھی نہیں۔ مگر اُن آنکھیں دوسریں
دو سجدہ بھی کر لیتی اور درود بھی پڑھ لیتی +

جہیز قدراست
 ۴۸ نوروز ۱۳۵۷
 از علامہ راشد بخیری

ضمیر ملا اس ماکے دودھ سے جو کام سے بیزار اور نام کی عاشق زار دریا ان
 آیاؤں کی گود میں جو روزے پنہیں اور نماز پکھلکھلائیں۔ انجام ظاہر تھا۔ بڑا ہوا تو
 کہنے کو مسلمان در نہ پورا کر سٹان۔ روزے کا نہ نماز کا، تذکرہ کا نہ نیاز کا تعلیم کی
 کیفیت یہ تھی کہ پانچ چار کتابوں کے بعد پھر آگے نہ پڑھا۔ نمود کا حال یہ تھا کہ بغیر انگریزی اجا
 لئے گھر سے باہر نہ نکلتا قسم۔ امیر کا بچہ المدآمین کا بچہ۔ لاٹو پیار کا بچہ۔ کھلتے پتوں کا
 بچہ اس کے جلان ہونے میں کیا دیر تھی۔ چودہ برس کا لڑکا فیل کا فیل معلوم ہوتا تھا
 مغلائی کو بیٹے کے بیاہ کا ارمان یوں تو مدت سے تھا۔ مگر اب تو ایک ایسا گھری ایک
 ایک سال تھی۔ دنیا بھر کی لڑکیاں چھان اور شہر بھر کے گھر کھنگال ڈالے۔ مگر لڑکی سمجھ میں
 نہ آئی خدا خدا کر کے ملی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اور ایک جگہ بات ٹھہری۔ مغلائی روپے کی
 بھوکی نہ تھی سمجھتی تھی اور ٹھیک، جانتی تھی اور درست کہ دولت اتنی کافی اور روپیہ اس
 قدر وافر ہے کہ بھر بھر جھولیاں اٹھاؤں اور روپے کی جگہ اشرفیاں لٹاؤں تو بھی بچہ کو تو
 میرے بچہ کو اور دو تین پشتوں کو روپے کا توڑا نہ ہوگا۔ وہ صرف صورت کی
 جویا تھی اور حق یہ ہے کہ خود بھی چونکہ حسین تھی اور اتنی کہ اس بڑے بچے یا ادھر
 میں رانڈ ہو کر اور سہاگ کھو کر سو دوسو میں ایک تھی اسلئے اس کی نش
 غلط نہ تھی لڑکی جو سمجھ میں آئی وہ مغلائی کی لڑکی تو نہ تھی۔ مگر عاتقا
 اچھی بہت اچھی۔ سہرا ل آئی تو دبی دبا۔ مفلس غریب میا
 کے رنگ اور ساس کے لڑکے کے کہ آج بھی کھل گئیں نہ سب تو اس کی ع
 ستہ کر لیا مٹا بھر میں اس کا نام تھا۔ ماں زمانہ کلب کی شہر کست
 آندھی ہو یا مینہ ناغہ نہ ہو سکتی تھی۔ مغلائی کا بیوہ کو اپنے رس
 پر لا نا ضروری تھا۔ چنانچہ لے آئی۔ کچی گڑی کا سیدھا کرتا
 بھیر لیا تھی۔ اشارے کی دیر تھی۔ بہر بھی اسی دگر پڑی میاں کے دطیرے وہ

کہ بغیر چھری کانٹے کے کھانے کو ماتہ لگانا گناہِ ساس کے ٹیوے یہ کچھ کہ ہندوستان
 جوتی پہننی حرام۔ بہو بیجاری نے آخر کیا قصور کیا تھا۔ تھوڑے ہی روز میں ساس
 کم تھی اور بہو زیادہ۔ ماں ایک بات تھی جو ساس کو ذرا کم مگر شوہر کو کچھ زیادہ ہمیشہ
 ناگوار گزری اور وہ باپوں وقت کی نماز تھی۔ بن باپ کی بچی اور مغس ماں کی بیٹی۔
 خدا مظلوم کو بہت یاد آتا ہے۔ کوار پتے کے جے جمائے خیال اور بیٹھے بٹھائے
 اثر جوانی میں اور تنول میں آسانی سے چھوٹنے والے نہ تھے۔ مزایہ ہوا کہ سسر پر آیا
 رمضان۔ مغلائی یا ضمیر کو تو غرض ہی کیا تھی کہ ہو کے رہتے اور یا سے مرتے
 ضمیر تو کھلے خزانے اور مانگے پکارے روزے دار مل پر رات دن ہنستا۔ مگر مغلائی
 اتنا احسان اندر پر ضرور کرتی کہ روزے کے بدلے دو آدمیوں کو کھانا مسجد میں بھیجتی
 اور یہ سمجھ کر کہ روزہ صرف غریبوں ہی کے لئے ہے یتیم خانہ میں بھی کچھ نہ کچھ بھیجتی
 رہتی۔ ایسے گھر میں اور اس قسم کے لوگوں میں رہ کر روزہ رکھنا آسان نہ تھا۔ دو تین
 روز تک تو دونوں ماں بیٹے خاموش رہے چوتھی سحری تھی کہ ضمیر نے ماں سے
 کہا۔

”یہ سحری کا عذاب تو اچھا پیچھے لگا کہ نیند بھی حرام ہو گئی۔ اول تو یوں ہی بارہ
 بجے سوتا ہوں اُس پر غضب یہ ہے کہ جہاں ایک دفعہ آنکھ کھل گئی تو پھر نیند نصیب
 نہیں۔ اگر ایسا ہی روزہ ضروری ہے تو آدمی اس طرح آگے بڑھے۔“
 نہ ہو۔ دو تین روز سے یہ ہی ہوا ہے۔ اچھا

”چٹ گئے“

ماں۔ ”بیٹا! غریبوں کے تو خدا اور

میکلیفیں ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں وہ

کہ روزے کے بدلے دو آدمیوں کو کھانا

اب ان ہی سے پوچھو میاں شاکسی۔ ساس ناخوش، روزہ سے فائدہ کیا اور حاصل کیا؟
ضمیر۔ موٹی سی بات ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کی حالت ہی ایسی تھی کہ پیٹ کو ٹکڑا اتھانہ تن کو جھٹھیر، ایک رمضان پر ہی کیا منحصر تھا۔ یوں ہی بارہ مہینے کے فاتے تھے اس وقت کی ضرورتیں اور تھیں اس وقت کی حالتیں اور ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے ان مفلس جاہلوں کا کہ اب تک وہی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔
ماں۔ تم اندر کی مسہری میں جا سو وکل سے کچھ اور انتظام کروں گی۔

ضمیر دہن جن کا اصلی نام ساجدہ تھا اس لائق تو تھی ہی نہیں کہ میاں یا ساس سے بحث کرتی۔ اول تو بہو، اس پر نئی دہن اور سونے پر سہاگہ افلاس دل ہی دل میں گزی جا رہی تھی۔ یہ وقت تو کٹ گیا اور دن گذر کر رات بھی آئی۔ مگر اس نیک بخت نے پھر سحری کا نام نہ لیا۔ دھونے کی آواز کان میں آئی اور چروں کی طرح آنکھ پانی پی کلی کر پڑ ہی وہ بھی اگر آنکھ کھل گئی۔ نہیں تو اول ہی شام تہیت کی اور لیٹ گئی۔ آدمیوں کی ماسٹار اندر گھر میں کمی نہ تھی۔ چار پانچ ماماں۔ پانچ چھ رشتہ دار۔ مغلائی ضمیر ساجدہ خاصے چودہ پسند رہ مسلمان ایک گھر میں تھے۔ مگر سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی خیال میں ڈوبے ہوئے۔ روپے کی سخت دونوں ماں بیٹوں پر کچھ اس درجہ چھٹا گئی تھی۔ آ۔ آ۔ اکھ بھول کر بھی تو خیال نہ آتا تھا۔

دور رمضان کیا رہنے والا تھا۔ آنکھ بند کر کے

سر پر آپہنچی۔ اب البتہ مغلائی کا گھر

نا ہوئی۔ زیور میں ڈورے پڑے۔ گاریوں پر رنگ،

کی دھوم و دھام میں مغلائی خاص اور عام

نرت میں شریک تو سارا گھر ہی تھا۔

مگر ساجدہ کے چہرہ سے جو حقیقی مسرت ٹپک رہی تھی۔ اس کا پتہ دوسری جگہ نہ تھا۔ اس کی خوشی کپڑے کی تھی نہ لٹے کی گھنے کی تھی نہ پاتے کی۔ اسکی خوشی ادائیگی فرض کا تخیل تھا۔ جس کی برابری ان قافی اشیا میں ایک بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس کا صرف یہ اندیشہ کہ خدا میرے روزے قبول کرے بی مغفانی کی تمام جلداء سے قیمتی تھا۔ ہلال عید نے اپنا رخ دکھا کر رمضان المبارک کو دواغ کیا۔ ساجدہ کو ٹھٹھے پر تھی۔ چاند دیکھا اور دعا مانگی۔

”اللہ العالمین مجھ گندگار کینز کے گناہ معاف کیجو“ یہ مبارک مہینہ برکت کے دن، رحمت کی راتیں ختم ہوئیں۔ مگر تیری نعمتیں موجود ہیں۔ اپنے فضل و کرم سے اپنے عطا و رحم سے میرے روزے قبول کر عذاب قبر سے محفوظ اور میرا سہاگ قائم رکھ۔“

دعا مانگ کر ساجدہ نیچے آئی۔ ڈوپٹہ سنبھال کر اڑھا اور ساس کو جھک کر سلام کیا۔ اس کا دل ایسی مسرت سے لبریز تھا۔ جس میں خوشی کا بھر بے پایاں لہریں لے رہا تھا۔ رات ختم ہوئی اور موزن نے روز عید کی آمد کا مژدہ پہنچایا۔ ساجدہ نے وضو کیا نماز پڑھی۔ ضمیر نے غسل کیا کپڑے بدلے۔ مغفانی نے غلٹی کی جڑ پھینا اور عید کے جلسے ہونے لگے۔ دن بھر وہ گہما گہمی۔ اور چیل پہل رہی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ منوں مٹھائی الغاروں ترکاریاں سیروں۔ دودھ اور تولوں عطر صبح سے شام تک ماتھوں سے اٹھے۔ دن بھر ڈولیوں اور گاریوں کا تانتا لگا رہا۔

روز عید میں کون سے لال لگے تھے کہ سال دو سال کا ہو جاتا۔ وہی بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات۔ دن کے ختم ہوتے ہی مردانے میں نایب اور گھر میں گانا بجانا شروع ہوا۔ باہر افعام و اکرام ملے اور اندر میل۔ آدمی رات تک

یہ ہی دھوم دھام رہی۔ مغلائی دن بھر کی تھکی ماری مسہری میں جا کر لیٹی۔
 آنکھیں بند کیں اور سونے کی تیاری، ٹخنے پر پٹ پٹ آنسو گرنے شروع ہوئے۔ دیکھتی ہے تو رشتہ
 کی خالہ زاد بہن بسم اللہ جواد پر کام کرتی تھی۔ پاؤں دوبارہ ہی ہے رورہی ہے
 پوچھا کیا ہے؟ نہ معلوم تسکین کا نتیجہ تھا یا دل کی کیفیت۔ طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی
 کوشش کی کہ کچھ پاؤں اقصا کیا کہ ضبط کروں۔ مگر ناکام رہی۔ اتنے عرصہ
 میں مغلائی تین چار بار اصرار کر چکی تھی۔ جب چرکار کر دریافت کیا تو کہنے لگی۔

”کیا عرض کروں۔ آپ آرام فرمائیے“

مغلائی۔ ”آخر کہہ تو سہی معاملہ کیا ہے؟“

بسم اللہ۔ کچھ نہیں آپا یوں ہی خیال آگیا۔

مغلائی۔ ”آخر وہ ایسا کیا خیال ہے۔؟“

بسم اللہ۔ آپ آرام کیجئے اب نہ روؤں گی۔

مغلائی۔ مگر بتانے میں کیا قباحت ہے کسی نے کچھ کہہ دیا۔“

بسم اللہ۔ جی نہیں۔“

مغلائی۔ ”تو پھر یہ اس وقت رونے کا کیا سبب ہے۔؟“

بسم اللہ۔

مغلائی۔ ”بتائیں پوچھ کر رہوں گی۔ بتا کیا ہوا۔؟“

بسم اللہ۔ ”میں دن بھر خدا کی قدرت دیکھتی اور اپنی حالت پر غور کرنی

رہی مجھ سے ابڑہ کر کم نجات شاید دنیا میں کوئی بھی نہ ہوگا۔ سات

ہینے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر کوئی دن اور رات ایسی نہیں جاتی کہ

جو بات آنکھوں کے سامنے ہے جو کائنات میں کھٹک رہا ہے اس کو فراموش

کر سکوں۔ کھاتی ہوں۔ بیٹتی ہوں۔ ہنسی ہوں۔ بولتی ہوں۔ دنیا کے سب کام اور

زندگی کی ہر ضرورت پوری کر رہی ہوں۔ بھوک مجھے لگتی ہے۔ پیاس مجھے
معلوم ہوتی ہے۔ نیند مجھے آتی ہے جاڑوں میں گرم کپڑے گرمی میں ٹھنڈا پانی
کوٹنا کام ہے جو میں نے چھوڑ دیا۔ مگر دل کی وہ کلی جو آج ہی کے روزا میں وقت
مر جھا گئی اب نہیں کھل سکتی۔ وہ صورت جس کو موت نے مجھ سے چھین کر ہی
گورنڈا دیا۔ میری آنکھ سے جدائیں ہو سکتی میرا شوہر میرے سر کا وارث
میری زندگی کا سہارا زیادہ دن نہیں اچنڈ گھنٹے بیمار رہ کر اسی عید کی آدمی
رات کو میری زندگی برباد کر گیا۔

عید کا وہ دن جس خوشی سے بسر ہوا اب بسر آنے والا نہیں۔ اور رات کو
جو ستم ٹوٹا۔ وہ دل سے جانے والا نہیں۔ شام کے وقت جب دل زیادہ تڑپا
تو آپ سے تنخواہ مانگی۔ کہ میں بھی قبرستان جا کر اپنی عید ملاؤں اور اس صورت
کے بدلے اس خاک کے ڈھیر کو سلام عید کر لوں۔ آپ نے اس وقت کچھ نہ
دیا۔ میں یوں ہی چلی گئی۔ رستے میں خیال آیا کہ مرنے والا دنیا بھر کے عیش کر لگیا
اچھے سے اچھا پہنایا اور بہتر سے بہتر کھلایا آج تو اُس کی قبر پر جس طرح
بنے ہو آؤں۔ برس کا برس دن دنیا عید کی خوشیاں منا رہی ہے۔ کانوں کی
بایاں اسی کا صدقہ اور اسی کا طفیل ہے۔ جب وہ نہیں تو یہ رہ کر کیا کریں گی۔ ان کو
پنچ کچوریاں اور مٹھائی لیکر قبر پر پہنچی۔ سینکڑوں مائی کے لال۔ بڑے بھی ادنیٰ بھی
اور جہان شیر ہزاروں من مٹی کے نیچے دبے پڑے تھے۔ تھوڑی سی فقیہ نیاں کچھ
اپناج اور معصوم بچے کھیلتے پھرتے تھے ان کو کھلایا اپنے ماتھے سے پانی لائی اور
پلایا اور دعا کی۔ کہ اس کا ثواب اس مرنے والے کی روح کو پہنچے۔ جھپٹتا ہو رہا تھا
کہ ملا جی نے اذان دی۔ دل نہ مانتا تھا اس خیال سے کہ آپ ناغوش ہو گئی۔ چلی
آئی مگر میرا دل وہیں پڑا ہوا ہے اور وہی رو رہا ہے کہ یاد آ رہے ہیں۔

آپا گھنٹے نے ابھی بارہ بجائے ہیں۔ آدھی رات کا یہی وقت تھا جب مرنیوالا میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا اُس نے مجھ کو قریب بلا کر میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ تسکین دی اور خدا کے سپرد کیا میں جانتی ہوں کہ وہ مر چکا اب رونا دعوتا بکا رہے۔ مگر دل کا علاج کیا کروں کہ کینٹ اسکی صورت کو نہیں بھولتا یہ آیا آج ہی کے دن اُسکا انتقال ہوا تھا۔ اب وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے گا۔ مگر آنکھوں کا کیا کروں کہ یہ کسی طرح سے نہیں تھکتیں۔

اتنا کہ کر بسم اللہ کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ روتی ہوئی کمرہ سے باہر نکلی۔ ادھر مغلائی خاموش تھی اور گھنٹہ بتا رہا تھا کہ رفتار عمر کس طرح طے ہوئی۔ ختم کہہ رہی تھی۔ کہ رات سحر ہوئی والی ہے۔ سوچنے لگی۔ کہ یہ بچاری بسم اللہ میرا ہاتھ تھکنے والی اس طرح یاوشوہر میں تڑپے اور میں جو ہزاروں صرف کروں کبھی بھول کر اس کا دعیان نہ کروں جس کی بدولت بیٹی راج کر رہی ہوں۔

اس خیال کا آنا تھا کہ مرحوم کی تصویر آنکھ کے سامنے پھری۔ اور موت کی خوفناک گھڑی سامنے آئی۔ سوچنے لگی۔ کہ موت بہر حال آئی اور یہاں سے جانا۔ مگر وہاں جا کر کیا کروں گی یہ تمام عیش آرام یہ سب جلوے جلسے زندگی تک کے ہیں یہاں کی تمام ضرورتیں خوب پوری ہوئیں نفیس سے نفیس کپڑے اعلیٰ سے اعلیٰ زیور قیمتی سے قیمتی بچپنا۔ افضل سے افضل کھانا۔ لیکن کوئی دن کیا کوئی گھڑی ایسی نہ گزری کہ وہاں کی ضرورتوں کا بھی خیال آتا اور سمجھتی کہ ایک روز اس زبردست بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ جس کی حکومت ابدی اور جس کا راج مستقل! میری صابھی عارضی۔ میری خوشیاں فانی۔ اور میری امارت پانی کا بلبلہ دریا کی ریت اور دودھ کا جھاگ بان ہی خیالات میں نعر قاب اور تفکرات میں ابھی کچھ دہڑپڑی رہی

چاہا بہت کہ نیند آئے۔ مگر نہ آئی۔ مجبوراً اٹھی اور ہر ٹہلی اور ہر ٹہلی۔ بڑی داروغہ کو بلا کر حکم دیا۔ قصہ سناؤ قصہ سننی رہی۔ مگر نیند کسی عنوان آئی تھی اور نہ آئی۔ دوسری داروغہ سے کہا کتاب پڑھو۔

کتاب خوان ”شروع سے کوئی کتاب پڑھوں؟“

معطلانی ”نہیں یہ لو۔ یہاں سے پڑھو“

کتاب خوان ”حدت کی دھند اور مغرب کی رسیا کلب کے جلسہ

سے لوٹتی تھی گرمی کا موسم تھا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے فرحت بخش آ رہے تھے۔ گاڑی ساتھ تھی۔ حکم دیا کہ گھر جاؤ۔ خود پیل چلنے لگی۔ وقت سہانا تھا۔ اور ہوا سرد، دھندل گئی اور ایسی سڑک پر جا پہنچی۔ جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چاروں طرف بھٹکتی پھری مگر کہیں رستہ نہ ملا۔ یہاں تک کہ رات نے سیاہی کا برقع روئے زمین کو اڑھا دیا اور جنگل میں سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف ننگاہ دوڑانی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مگر آدمی نہ آدم زاد۔ دل ہوا ہوا۔ کلیجہ دھکڑ دھکڑ کرنے لگا۔ ہوا کے فراٹوں کے سوا اس اندھیرے گھپ میں اور کوئی آواز نہ تھی۔ چیچی چلائی دوری۔ پکی۔ حیران پریشان ٹھیری بڑھی۔ گرجے سود اور بیکار خوف کے مارے اور دہشت کے سبب دم نکل رہا تھا اور دم فنا ہو رہی تھی آسمان کے تارے بھی ٹھٹھے لگا لگا کر روپوش ہوئے اور سیاہ گھٹانے ڈیرے ڈالے دھندہ اولوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی اور سفید چادر بیابان کے ہر چہ میں بچھ گئی۔ بادل کر دک رہے تھے مگر بجلی مطلق نہ تھی۔ او لے پڑ رہے تھے۔ لیکن منہ بہت ہلکا تھا۔ بوندیاں تھیں مگر کم جس کی پچھلی عمر، اسن طرح بسر ہوئی کہ رنج خواب میں اور تکلیف بھول کر بھی پاس آ کر نہ پھٹکی اس پر جو کچھ گذرتی رہ بیان سے باہر ہے۔ ساکت تھی۔ خاموش تھی۔ سہمی ہوئی۔ ڈوری ہوئی۔ لرز رہی تھی۔ تھڑا رہی تھی۔ گھبرائی ہوئی۔

سٹ پٹائی ہوئی۔ کبھی ادھر سے ادھر بھاگتی اور کبھی ایک جگہ کھڑی ہو جاتی۔ مگر اطمینان کی کوئی صورت پناہ کی کوئی جگہ میسر نہ آتی نہ نصیب ہوئی۔ گیدڑ چیخے۔ لنگوڑ چلائے۔ سانپوں کی پھنکار تھی۔ اولوں کی بھرمار تھی۔ چٹائیں تھیں۔ پہاڑ تھے۔ راکھ کے ڈھیر تھے۔ خاک کے انبار تھے اب جدت کی شدید انگیم کو یقین ہو گیا کہ دم نکلا اور جان چلی۔ یہ قیامت خیز سماں یہ مصیبت انگیز وقت خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ستائے کا میدان اور ہوا کا عالم تھا۔ رستہ بتانا تو دور کرنا کوئی بات تک کرنے والا نہ تھا۔ کپڑے چوڑا بدن۔ شور بہ شور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر رونے لگی۔ خدا خدا کر کے سامنے سے روشنی نمودار ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ مرنی والا شوہر ماتہ میں چراغ لئے رو برو کھڑا ہے۔ کپڑے سپید براق۔ لگی جینس مارنے مگر ہوتا کیا تھا اور سننا کون تھا بدن میں رعشہ، ماتہ پاؤں میں کپکپی، چاہتی تھی زمین میں دھنس جاؤں درخت میں گھس جاؤں کہ مردے نے اپنا ماتہ بڑا یا اور کہا۔

رمضان کا مبارک مہینہ آئے اور نکل جائے فرشتے اور انسان اس کے فراق پر آنسو گرائیں اور تجھ کو تیرے گھر والوں کو غیرت تک نہ ہو۔ خدا کے نیک بندے اپنے معبود کے حکم کی تعمیل میں لبیک کہیں اور توان پر خفا ہو۔ ایک لبیک لڑکی۔ ایک مسلمان عورت تجھ جیسی ناہنجار اور جفا شعار کے قبضہ میں پھنس کر سحری و افطار سے محروم ہو۔ مسلمان کا گھر اور سحری گناہ۔ منظم تیرے ظلم سے اور محکوم تیرے حکم سے دو گھونٹ پانی کے پی کر روزہ رکھے۔ تو ڈٹ ڈٹ کر کھائے اور تن من کر پیئے۔ اور روزہ دیا بارہ تیرہ گھنٹے کا پہاڑ ببادن گزار کر بھی پانی سے افطار کرے افسوس تیری حالت پر۔ اور شرم تیری صورت پر!

بدبخت ! وہ وقت زیادہ دور نہیں جو بتا دے گا کہ جس کو اپنا

سمجھا وہ غیر تھا۔ اور جس کو غیر جانا وہ اپنا تھا۔

مغلانی شروع ہی کی سطریں سننے پائی تھی کہ اس کی آنکھوں میں ہمر

گزشتہ اور حالت موجودہ کا تمام نقشہ پھر گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ خود اسی کی

تاریخ کوئی شخص لکھ رہا ہے، بسم اللہ ہی کی مصیبت نے اس کی طبیعت خواب

کردی تھی۔ کتاب نے بالکل ہی بے قابو کر دیا اور یہ حالت ہو گئی۔ کہ گویا نصیر اس

کی بربادی کی داستان بیان کر رہا ہے۔ سننے ہی سیری کی طرح تھر تھر کا پنپنے

لگی۔ سب کو ہٹا دیا۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ اب نیند کہاں۔ کھڑی ہوئی اور صحن

میں آئی تو پو پھٹ رہی تھی۔ اور یہ سماں بجائے خود اس قدر مؤثر تھا کہ ہر شے پر

جو آنکھ کے سامنے تھی فنا کا جلوہ برس رہا تھا اور خصیبت ہوتی ہوئی رات جو

مریض کی طرح دم توڑ رہی تھی آنے والے مہمان سے گلے بل بل کر بے ثباتی دنیا

کے نعرے لگا رہی تھی۔ اس منظر نے یقین دلایا۔ کہ موت سر پر آ پہنچی۔ ندامت

کے آنسوؤں سے روتی ہوئی نماز کو کھڑی ہوئی +

بھلائی

تیسرا باب

بھلے گھوڑے کو ایک چابک، بھلے آدمی کو ایک بات ! مغلانی اگر آدمی ہوتی

اور آدمی ہی سمجھدار، تو بسم اللہ کی داستان اور کتاب کا بیان دونوں عمارت

زندگی کی ان بنیادوں کے واسطے جو کمزور ہو چکی تھیں اڑواڑہ کا کام دیتے اور

ڈنگلاتا ہوا ایمان پہاڑ کی طرح مضبوط ہو جاتا۔ مہرجانی اور اس سبق کو نہ بھولتی۔

کھوئی ہوئی دولت اور گئی ہوئی نعمت خدا نے گھر بیٹھے بھیجی۔ مگر طبیعت میں شرافت

ہوتی اور اصلیت سے بے خبر نہ ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ دو چار دن تو تسبیح

بھی کھٹا کھٹ رہی اور نماز بھی جھپا جھپ۔ مگر ادھر تو لڑائی عقل اور ہرگز اوقات

وہ درمیانہ خوف نماز تو خیر گنڈے دار ہوئی مگر تسبیح کا جوش بند رہا۔ نہ بھی نہ رہا۔ اور آخر کار دونوں القط۔ وہی دنیا اور دنیا کے دھندے وہی کلب اور کلب کے چندے۔ اس گودکی اور اس دودھ کی ایسی مال کی اور ایسی عورت کی اولاد جیسی اٹھتی ظاہر ہے۔ ضمیر آغاز شباب ہی میں عذاب ثواب کا قائل نہ تھا اور اتنا مسلمان تھا کہ بیوی کی سحری اپنی نیند پر قربان کر دی۔ پورا جوان ہو تو عمر کے ساتھ ہی ساتھ لاندہ بی میں بھی ترقی کرتا گیا۔ نعلیہ اس پر آتا ہے کہ پڑھائیں۔ لکھا نہیں۔ مگر مشکل سے مشکل مسئلے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مرحلے میں رائے دینے کو موجود اور صلاح دینے کو تیار۔ حدیث قرآن۔ فقہ۔ منطق کوئی بحث ایسی نہ تھی۔ جس میں وہ بند اور کوئی گفتگو ایسی نہ تھی۔ جس میں وہ خاموش۔ مگر بڑی خرابی اگر یہ پڑی کہ میاں بیوی سکھ مزاج میں آسان زمین کا فرق تھا۔ ساجدہ اول اول تو میاں اور ساس کے رنگ دیکھ اسی طرف ڈھل گئی تھی۔ بلکہ ان سے بھی دو قدم گئے مگر نیچے میں ایک روز وعظ تھا وہاں جو مولوی صاحب کی تقریر سننی تو لرز گئی اور عہد کر لیا کہ جان رہے یا جائے اور گھر بگڑے یا سنو رہے میں اس ترقی کی طرف قدم نہ اٹھاؤں گی۔ جو حقیقت تنزل کا پوشیدہ راز ہے۔ وعظ تو معمولی تھا۔ مگر خاتمہ کے الفاظ جو ساجدہ کے دل میں گر گئے یہ تھے۔

بیویوں! اگر وہ پہلی آواز جو فانی دنیا نے کان میں پہنچا کر ایک بڑبڑ طاقت کا اعلان کیا یا وہ تو صداقت کے کانوں سے سنو اور انصاف کی نظر اس فحش حیات پر ڈالو۔

اس درخت پر رنگ برنگ کے طائر اپنی اپنی بولیاں بول گئے اور ایسے ایسے نغمے گائے کہ اب تک ان کا رس کانوں میں موجود

ہے۔ ان کا قیام ایک رات کا بسیرا تھا۔ وہ اذان مغرب کے ساتھ ان ڈالیوں پر چپکے اور نماز فجر سے قبل رخصت ہو گئے۔ اگر پانی کے وہ چند قطرے جو سب سے پہلے جد خاکی پر پڑے اور جن کی تہ میں مل آخربیاں تھا۔ فراموش نہ ہوئے ہوں تو شوق کے قدم بڑھاؤ ایمان کی آنکھیں کھولو اور دیکھو اس جہنم کی زندگی میں ایسے ایسے گلابائے رنگین کھلے ہیں۔ جن کی خوشبو نے ایک دنیا کو مہکا دیا۔ ان کا عرصہ حیات صرف ایک رات تھی۔ غروب آفتاب نے ان کو زندہ کیا۔ اور صبا کی سرسراہٹ سے پہلے مر جھا گئے۔ اب وہ طائر ہیں نہ پھول۔ مگر ان مسافروں کے نقش پا ابھی موجود ہیں۔ ان کے کارنامے ماہ کامل کی طرح روشن اور آب زلالی کی طرح صاف ہیں۔ آؤ باغیچہ فانی کے ان سرسبز و شاداب پودوں پر نظر ڈالیں۔ جنہوں نے عورت کی ہستی میں ظہور کیا۔ آج بھی وہی چہرے ہیں۔ وہی صورتیں۔ وہی کھڑے ہیں وہی موڑیں۔ مگر ان چہروں پر وہ نور ان پھولوں میں وہ خوشبو، ان پودوں میں وہ طراوت نہیں جو آج سے نصف صدی پیشتر تھی۔ ان قدموں پر قدم رکھو۔ پتہ دہڑو اور سرائع لگاؤ کو کشش اس جگہ پہنچا دے گی۔ جہاں تلاش کی آنکھیں تماشے دیکھیں گی۔ جن کے ساتھ ہی شان اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ صورتیں دیکھو گے جن کی رگ رگ سے ادھگر دیکھو گے جن کے چہ چہ سے اسلام کی صدائیں بلند ہونگی۔ مگر دل بھر کر دیکھنا، جی بھر کر ٹھیکرنا اور پیٹ کر دیکھ لینا آنکھیں ان صورتوں کو جی ان باتوں کو۔ دل ان معاملات کو اور نگاہیں ان خیالات کو نہیں گی

میں
دیکھا جاتی تھی

اور ناکام ڈونڈیں گی اور بے سود یہ وہ عورتیں ہیں جن کے سفید بال
منانت کی نگلھی سے آراستہ اور جن کے خلوں بکری دل صداقت
کے پھولوں سے مزین ہیں ان کے سروں پر جالی کے ڈو پٹے
احمد آبادی اور گجراتی بیلوں سے مزین نہ ہوں۔ مگر ان کی موٹی چادریاں
لکھے اور نین سکھ کی دہریں خوف خدا کے بیش بہا کھنٹوں اور گجروں
سے جھک رہی ہیں۔ یہاں مذہب زبان سے کہنے اور قلم سے لکھنے
کو نہیں ہے، جمہور کی لڑکیوں میں، مالا کے ڈوروں میں دمک
رہا ہے اجمالوں میں، اور بالوں میں اچھیوں میں اور چالوں میں
حیا ان کا زیور ہے۔ شرم ان کا لباس، ادب ان کا جوہر ہے۔
اور رحم ان کا شیوہ، دیکھو سامنے دیکھو اور اس خاتون پر نظر ڈالو
یہ بال کا میانی حیات کا سہرا باندھ کر سفید ہوئے ہیں۔ یہ آنکھیں
گھڑیوں خوف خدا سے روئی ہیں۔ اور یہ پستانی گھنٹوں سجدے
میں رہی ہے۔ یہ مفلس اور فقیر نہیں، وہ ہے جس کے ہاتھ سے
ہزاروں لاکھوں روپیہ عمر بھر اٹھا اور اب بھی ایک معقول خاندان
اور پورے گھرانے پر حکومت کر رہی ہے۔ یہ نواسوں کی تالی اور پونوں
کی دادی ہی نہیں نوکروں کی آقا اور لونڈیوں کی مالک بھی ہے۔
اقبال کے سایہ میں جوانی بڑھاپے سے بدلی اور آج خلق کی زنجیر
اس بوسیدہ گھر اور تنگ مکان میں گھسیٹ کر لائی ہے چھوٹے
لڑکے کا بیاہ ہے اور مفلس بھانجی کو بلاوا دینے خود آتی ہے !!
اس منہ سے باتیں نہیں پھول جھڑ رہے ہیں۔ یہ پھول رہنے
والے نہیں۔ اپنے دامن بھرو۔ زمانہ بہت جلد چمن اسلام کو

ان جوہروں سے محروم کرنے والا ہے۔ یہ واقعات فسانہ اور معاملات خواب و خیال ہو جائیں گے۔ صداقت کی شہادت پیش نظر رکھ کر ایمان کی ترازو ماتھ میں لے کر فیصلہ کرنا اور بتانا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ لو دیکھو!

اے ہر مریم! قربان کی تمہی پیک۔ میرے توفرشوں کو بھی خبر نہیں ایک کیا چار کرتوں کی بھی جدبختی۔ اس مردار نے مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔

حرمیم۔ خالہ اماں پیک کا کیا ہے۔ یہ تو میں نے ایک بات یوں ہی کہی اللہ آپ کو شادی رچانی نصیب کرے۔ میں تو بڑی خوشی سے چلتی۔ مگر ادھر تو بچوں کو دیکھ لیجئے اس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں، اُس کے کانگن نکل رہی ہے ادھر ان کے اپنے کھانے پینے کا کچھ انتظام نہیں۔ خدا نے چاہا تو کسی چالے میں اگر شرک ہو جاؤں گی۔

خالہ۔ بیٹی کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہے نیچے اچھے نہیں ہیں تو وہ بھی تو اپنا ہی گھر ہے۔ کسی غیر کا نہیں۔ جو ضرورت ہوگی انتظام ہو جائے گا۔ میاں کی تم نے خوب کہی۔ بیٹیاں سیکے جاتی ہیں تو کیا دامادوں کے کھانے کا الگ انتظام ہوتا ہے کیا ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ گھروالی کے آنے سے مرد کو کیسی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بھی کہیں دنیا میں ہوا ہے کہ بیٹی کو تو بلا لیا اور داماد کو بھول گئے۔ پہلے کھانا ان کا پیچھے تمہارا۔ جو چٹنی روٹی امد دے گا۔ پہلے ان کو پیچ جائیگا۔ پھر تمہارے آگے رکھیں گے بلاو اور حقیقت ان ہی کا ہے مگر تم کو جا رہی ہوں ابھی تو زمانہ نے اتنی ترقی نہیں کی کہ بیٹیوں سے واسطہ رکھیں اور دامادوں کے آرام سے غافل ہو جائیں

بیٹی تمہارا چلتا ضروری ہے اور تمہاری شرکت لازمی ہے۔ کیا میرے دل میں وہ ہم نہ آئیگا کہ سگی ماں جانی جہاں آرائی بھی شہر کے شہر میں موجود ہو

دولہا کے سر پر آخبل نہ ڈالے۔ میری آنکھیں تو آج تین تین دن سے جہاں آرا کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ زندہ ہوتی تو بھانجے کو دودھ پکھڑا کر کتنی خوش ہوتی ۛ

مریم۔ یہ تو آپ درست فرماتی ہیں۔ مگر میری حالت کو بھی تو دیکھئے خیر گناہا تو اکتدیر کا ہے شکوہ نہیں۔ مگر کپڑے تو ڈھنگ کے ہوں۔ کچھ ایسی اگر پڑی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی آپ بڑی ہیں مگر بھائی تو چھوٹا ہے اس وقت تو آپ معاف کیجئے پھر دیکھی جائے گی ۛ

خالہ۔ لڑکی تیری عقل کو کیل ہو گیا۔ امیر غریب ایک ہی تھان کے کمرے ایک ہی تھیلی چتے بٹے ہیں۔ پتے کیسے ہی ہو جائیں۔ کوئی سبز ہے۔ کوئی زرد۔ مگر جب تو ایک ہی ہے۔ میں نے دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ کپڑے اور گستا لے آئی ہوں۔ مم منہ ہاتھ دھوؤ۔ گنگھی چوٹی کرو۔ بچوں کو نہلا دو۔ ان کے کپڑے بھی موجود ہیں۔ گاڑی تیار کٹھری ہے۔ مریم جلدی کرو۔

مریم۔ کیا عرض کروں اس وقت تو جانے ہی دیجئے میں انتظار اللہ دوچار روز میں حاضر ہوں گی۔

خالہ۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے جو تم کو دہم نہیں آتا کہ بھائی کے سر پر آخبل نہ ڈالو ۛ

مریم۔ پھر آپ فرمائی گی کہ ان لڑکیوں کے دماغ بگڑ گئے ہیں۔ کیا آخبل ڈالنا نہایت ضروری چیز ہے۔ میں تو اس کو ایک فضول رسم سمجھتی ہوں آپ اس پر اس قدر زور کیوں دیتی ہیں ۛ

خالہ۔ بندیں نے تو یہ کبھی نہیں کہا۔ کہ ان لڑکیوں کے دماغ بگڑ گئے۔ ہاں یہ کہتی ہوں کہ جدت نے ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی چکا چوند پیدا کر دی ہے کہ اپنے اصلی جوہروں کو فراموش کر رہی ہیں۔ تم اس آخبل ہی کو لے لو۔ فضول کہہ رہی ہو ۛ

مگر اس میں ایجا و کرنے والوں نے کچھ نہ کچھ ضرور رکھا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنجل اتنی ضروری چیز ہے۔ کہ بغیر تمہارے آنجل کے نکاح ہی نہیں ہو سکتا یا تمہاری شرکت آنجل میں نہایت ضروری ہو۔ ماں میں اس کی خوبیوں کی قائل ہوں اور یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم اپنی قدامت کی قدر نہیں کرتیں کیا تم کو اس سے انکار ہے کہ بیٹی پر ایسا دھن ہے اور وہ شوہر کی ملکیت ہے شادی کے بعد جو حق شوہر کا اس پر ہے وہ والدین کا نہیں ہے

محرکم۔ سچی نہیں سہرگز انکار نہیں۔

خاتمہ۔ بس تو مجب یہ یقین ہے تو یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ داماد ایسے بھی کو موجود ہیں۔ جن پر بیٹہ قربان نہیں تو آئین کے سانپ ہیں۔ اوہر بابا پ کو اس سے زیادہ عمر میں کوئی خوشی ہوگی کہ بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہے یا کیا یہ ضرور نہیں ہو کہ وہ اس خوشی میں بیٹی اور داماد کو بھی شریک کریں۔ کیونکہ شرکت کو وہ کسی طرح لازمی اور ضروری تو کر ہی نہ سکتے تھے۔ ماں یہ رسم مقرر کر دی کہ بہن بھائی کے سر پر آنجل ڈالے اور بہنوں کو دولہا بنائے۔ تاکہ داماد اس شرکت کو معمولی بات نہ سمجھے کچھ زور ان رسموں کا بھی پڑے اب اگر داماد کا اس شرکت میں کچھ خرچ ہوا ہے دور سے آیا ہے تو اس کا نیک بھی مقرر کر دیا کہ بابا دیکھ کہ بیٹی داماد کا کیا اٹھا۔ اس رقم کو نہ صرف ادا کر دیں۔ بلکہ مجیدیا موقع ہو اس بہانہ سے سلوک کریں۔

دوسری بات اور ہے دولہا گھر میں آیا۔ وہ دولہا کی حیثیت سے تمہاری رائے میں ہتاش بشاش ہوگا۔ مگر ہماری رائے میں اسکی حیثیت میں شرم و حجاب بھی ہے کہ بڑی بوڑھیوں کے سامنے دندلتا ہوا داخل ہو گیا۔ وہ اگر تنہا ہوگا تو اس کا حجاب اور ترقی کرے گا۔ اس لئے دروازہ ہی میں برابر کی بہنیں اس کی شرم میں شریک ہو کر اس کے حجاب کو دفع کر دیں۔ ایک تیسری بات اور ہے دولہا اس سے پہلے

گھر میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دولہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا استقبال بھی کیا جائے گھر کا رستہ بھی بتایا جائے۔ دولہن والیاں اس وقت سامنے آئیں سکتیں کیا یہ معقول تدبیر نہیں ہے کہ خود بہنیں ہی اس سلسلہ میں اس کام کو انجام دے لیں۔ ایک چوتھی بات اور سنو کچھ ضرورتیں ایسی پیش آئیں کہ چپکے سے کوئی بات دولہا سے کہنی ہے یا کچھ ہدایت کرنی ہے۔ کیا اس وقت کا نا پھوسی کرنا بد تہذیبی نہیں؟ آنچل کے مہمان سے کیا یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی؟ رہی پردے کی احتیاط وہ ظاہر ہے۔ یہ ہیں تمہارے قدیم طریقے جن پر آج منہ آتی ہو۔ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ وہ رسمیں جو خود ہماری تجویز نہیں بلکہ دوسروں سے لیکر ہم نے اپنے ماں شامل کر لیں۔ یقیناً قابل اصلاح ہیں۔ لیکن ہمارے اپنے طریقے تو سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔ اب تعلیم جو گل کھلا رہی ہے وہ ظاہر ہے اس کا بڑا حصہ محض نفسانیت کی ترقی ہے۔ ابھی پرسوں کی بات ہے میں تمہاری بہن کے ماں بیٹھی تھی۔ فیو کی ماں اتنے دنوں کی مانتوا مانگ رہی تھی بیوی دینے بیٹھیں تو چار دن کی بیماری کی تنخواہ صاف کاٹ لی۔ میں تو میرے پیٹ کی مگر میں تو دنگ رہ گئی۔ چھ سات برس کی خدمت کرنیوالی۔ چار دن بیمار ہو گئی تو غضب مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے کہہ دیا "بیٹی یہ تو زیادتی ہے"۔ فرماتی کیا ہیں آپ اس میں دخل نہ دیجئے۔ نوکر اسی طرح درست رہتے ہیں؟

بھلا بیوی میں یہ باتیں کیا جانوں۔ میں نے تو اماں جان کو دیکھا ہے ان کے پاس ایک مانتھی۔ کرم بی اس کا ایک بھتیجہ تھا فضلو۔ باپ ڈیڑھ مہینہ کا چھوڑ کر مرا کوئی دو سال کا ہو گا۔ کہ ما بھی مر گئی۔ پھوپھی کے ساتھ رہتا تھا۔ خاصا چودہ برس کا ہو گا کوٹھے پر کھڑا کنوا آزار مانتھا پاؤں پھسلا اور دو منزلے سے گر کر نیچے آیا۔ عمر تھی پنج گیا۔ مگر ایک ٹانگ ایسی بیکار ہوئی کہ دنیا بھر کے علاج کروائے اور کسی طرح آرام

نہ ہوا۔ بد نصیب کی ماں تھی نہ باپ ایک پھوپھی ہی پھوپھی تھی۔ اس درد سے رات بھر کراہتا کہ کلیجہ پر چوٹ لگتی۔ ڈیوڑھی میں پڑا رہتا تھا۔ اور کوئی اتنا نہ تھا کہ کبھی تک اڑا دے۔ رات کے وقت کرم بی جا کر تھوڑی دیر بیٹھ جاتی مگر بھائی کی اولاد اور اپنی اولاد میں یہ فرق ہوتا ہے کہ چند روز میں کتنا گئی۔ بیچ حج کا بے وارث وہ تھا کہ دنیا کی کروڑوں مخلوق میں ایک زندہ روح ایسی نہ تھی کہ اس کی مانگ پر تیل کی مالش کرے کرم بی بھی ٹل جاتی اور تیمم ایک ایک کا منہ دیکھتا اور تڑپتا۔ ایک رات کا ذکر سے بارش ہو رہی تھی اور ہوا مرین کے زخموں پر پھیر یوں کا کام کرتی تھی۔ کوئی نوبت ہوئی اس نے اماں جان کو بلایا وہ سامنے کا بچہ تھا۔ پردہ نہ کرتی تھیں۔ دونوں وقت کی روٹی اور دو کو ایک پیسہ روز دیتی تھیں ایک مکا اُس کے سر مانے پانی کا اور چوکی پائنتی رکھوا دی جب وہ گئیں تو فضا ہاتھ جوڑ کر کہنے لگتا :

”یگم صاحب آج میری حالت خراب ہے ہاں اب خدا کے سوا کوئی وارث نہیں۔ میرا اگر دنیا میں کوئی سہارا ہے تو آپ کی ذات۔ مجھے شام سے سردی بہت لگ رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دم نکل رہا ہے پھوپھی سے دو تین دفعہ کہا۔ نہیں سنا۔ یگم صاحب میں کانپ رہا ہوں اپنے بچوں کا صدقہ کوئی رضائی دے دیجئے۔“ اماں جان نے اگر رضائی نکالی اور اپنے ہاتھ سے جا کر اڑھائی بات گئی گزری ہوئی۔ کوئی پندرہ روز بعد کا ذکر ہے کسی بات پر چھوٹی آپا کرم بی سے خفا ہو گئیں اور بات ایسی بڑھی کہ کرم بی اپنا اختر بختہ سنجال سیدھی ہوئی۔ چھوٹی آپا اس کا تو کچھ نہ کر سکیں۔ نزلہ بر عضو ضعیف۔ جھونٹل اتری تو غریب پر۔ گئیں اور کہا ”جاتو بھی جا۔ جب پھوپھی ہی چلی گئی تو تیرا یہاں کیا کام۔“ اب ذرا اس وقت کا خیال کر لو ایک بن ما باپ کا بچہ۔ اپا بیچ۔ تیمم ایک طاقتور گھروالی کے حکم سے اس حالت میں کہ وہ کروٹ بھی مشکل سے لے سکتا

نکل رہا ہے۔ تم خود ہی اندازہ کرو کس طرح چار پائی سے اترا اور چلا ایک باشت چلتا ہے اور چپک کے مارے جان نکل نکل جاتی ہے۔ روتا ہے۔ چیختا ہے۔ چلاتا ہے اور پھر تھم کر آگے بڑھتا ہے۔ تین چار گھنٹے میں مشکل سے دس بارہ گز چلا ہوگا۔ رات چاندنی تھی اور موسم سرد و بد نصیب لحاف لے جا سکا نہ چادر۔ ماں تباہ نے مظلوم یتیم کو آغوش میں لیا۔ دس بجے ہوں گے کہ ابا جان آئے اور آتے ہی پوچھا "فضلو کہاں ہے"۔ چھوٹی آپا نے کہا کہ کم بی نکل گئی ہیں نے اُس کو بھی نکال دیا وہ تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ بہت بُرا کیا۔ اماں جان نماز عشاء پڑھ رہی تھیں۔۔۔ اور ان کی نماز کا یہ حال تھا کہ مجھے یاد نہیں انہوں نے نماز کے آگے کسی چیز پر دعا کی ہو۔ یہاں تک تمہاری اماں کے مرنے کا تارا یا بیماری کی خبر پہلے سے تھی۔ سب گھبرا گئے۔ مگر انہوں نے نماز نہ چھوڑی۔ مگر یہ سنتے ہی کہ فضلو کو نکال دیا انہوں نے سلام پھیر کر اتنا تو کہا۔

ہے ہے کم بخت یہ کیسا ظلم کیا" ۷

اور برقع ہاتھ میں لے دیوڑھی میں آئیں فضلو موٹر پر پڑا سکر رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں تو ابا جان۔ رات خاصی آگئی تھی۔ سڑک پر ستانا تھا ان سے چار پائی کپڑوائی اس کے پاس گئیں جب گایا اور چار پائی پر لٹا کر لائیں۔ ابا جان چلے آئے وہ اس کے پاس بیٹھیں۔ میں وہاں گئی۔ فضلو کی نگاہ اماں جان کے چہرے پر تھی۔ اس میں کیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتی۔ مگر اتنا کہہ سکتی ہوں دنیا کی بیش قیمت سے بیش قیمت شے اس کی برابری نہیں کر سکتی۔

گو بیٹی مریم! چلو! جلدی کرو۔ میں تم کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ چھوڑ دوں گی

نہیں

بہار قدامت ختم ہو چکی۔ غریب رشتہ داروں کا مان رکھنے والیاں

قبروں میں چاسویں۔ اب نفائیت کا دور دورہ ہے۔

تقریر کا اثر تھا یا وعظ کا نتیجہ ماہیوں کے خیالات کا جو اثر ساجدہ پر پڑا تھا ایسا زائل ہوا کہ چھینٹ بھی نہ رہی اور ایسی حالت میں ساجدہ کی زندگی سانا اور میاں دونوں کے واسطے خاصی مصیبت تھی۔ میاں کی زبان سے برسوں خدا کا نام نہ نکلے بیوی قدم بھی اٹھاتی تو بسم اللہ کہہ کر۔ باوجود اس غرت اور حشمت کے جو خدا نے اس کو دی۔ وہ میاں کی محبت۔ ساس کی عنایت اور اپنی حالت کو نہ بھولی۔ کھانسی، بخار، درد۔ کوئی تکلیف ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ نماز مانع ہو جائے۔ کرکڑ اٹے جاڑوں میں بیماری کی حالت میں ٹھنڈے برف پانی سے وضو منظور۔ مگر نماز کا نہ پڑھنا تو کیسا قضا پڑھنا بھی منظور نہیں۔ ضمیر نے اپنی طرف سے بہت سمجھایا۔ مگر اس نے نماز نہ چھوڑی۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس نافرمانی کی سزا ساجدہ کو یہ ملتی کہ ضمیر اس کی صورت سے بیزار ہو جاتا اور یہ دیکھ کر کجخت اسی جہالت کا پینا پیٹے جا رہی ہے۔ بات تک کرنی چھوڑ دیتا۔ مگر ایسا نہ ہوا اس سرتابی پر بھی ضمیر اس کی صورت کا دیوانہ تھا اور اگر یہ نہ کہا جاسکے کہ ساجدہ کا خدا اس کے ساتھ تھا تو اس کہنے میں کیا تامل ہو گا کہ زیور پہن اگر اور پیٹ بھر کر فاقے اور مصیبت ہمیشہ اس کے پیش نظر ہے اس نے جس طرح تکلیف کو عارضی اور اذیت کو فانی سمجھا اسی طرح راحت کو چھپاؤں اور سترت کو چاندنی۔ انسو س یہ ہے کہ مغلائی دنیا کی راحتوں کو جلد ختم کر گئی ورنہ وہ کم سے کم یہ دیکھ لیتی کہ لاپرواہی کے جو بیج وہ گھر میں بو رہی ہے۔ یہ آئندہ نسلوں تک کو غارت کر کے بھی پیچھا چھوڑیو اے میں کچھ ایسی بڑھیا بھی نہ تھی۔

پچاس باون برس کی عمر۔ بندھی ہوئی کاٹھی۔ گھٹا ہوا بدن۔ آوہ سیر بالائی مرتے مرنے

نافع نہ ہوئی مرنے کی عمر تھی نہ اندیشہ، دکھ نہ بیماری، خاصی اچھی بھلی جنگی۔ کلب سے
 آتی جون کا مہینہ تھا گرمی تڑاتے کی پڑ رہی تھی کچھ رستے کی تھکان کچھ واقعی حیس۔
 آتے ہی نہائی۔ نہا کر اٹھی۔ بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ بخار چڑھا اور ساتھ ہی سینہ
 میں درد۔ اسی وقت ڈاکٹر لینڈی ڈاکٹر ہندوستانی ڈاکٹر گوراڈاکٹر سب جمع
 ہو گئے۔ تین دن اور تین رات اسی طرح پڑی رہی چوتھے دن حالت بگڑ گئی
 بہوتھی تو پرانی جانی۔ مگر ساس کی پٹی لمحہ بھر نہ چھوڑی نجاست۔ صندل اور
 تھوک امرت کر دیا۔ بھر بھر رومال بلغم کے اپنے ہاتھ سے پھینکتی اور تیوری پر بل
 نہ آتا۔ یہ جس کا کام تھا۔ اُس اللہ کے بندے یعنی ضمیر نے ذرا پرواہ نہ کی۔ غیروں
 کی طرح دونوں وقت آیا کھڑے کھڑے خیر سلاج پوچھی اور چلتا ہوا۔ ماترپ رہی
 ہے اور بک رہی ہے۔ مگر اس کے کان پر جوں نہیں چلتی۔ حدیہ ہے کہ ماکا جنازہ
 احاطہ میں پڑا رہا۔ مگر وہ جب تک کنگھی۔ برش۔ کوٹ پنلون سے فارغ نہ ہو گیا۔ باہر
 نہ نکلا۔ بی مغالانی کو آخری وقت معلوم ہوا کہ جس صورت کی دیوانی اور جس لال کی
 پروا نہ تھی وہ بھی اپنا نہ تھا۔ چوتھے روز جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو اُس نے
 بیٹے اور بہو دونوں کو بٹھا کر کہا۔

”اب میں دنیا سے رخصت ہوتی ہوں۔ لیکن اس خیال سے
 خوش ہوں کہ گھر اس عورت کے سپرد ہوتا ہے جو اس وقت کنبہ
 بھر کا مول ہے۔ میں خوش نصیب تھی کہ خدا نے مجھ کو ایسی بہوی
 اچھا بیوی میرے پاس آؤ۔ میرے گلے لگو۔ کہ میں تم کو خدا کے سپرد
 کروں۔“

ضمیر ماکہ یہ گفتگو سن کر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ مگر ساجدہ
 آنکھ سے آنسو گرنے لگے۔ وہ روتی ہوئی بڑھی ساس کے ماتم کو

بوسہ دیا۔ تسکین دی۔ ضمیر کو گئے مشکل سے آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا۔
کہ ما دنیا سے رخصت ہوئی۔ ۛ

چوتھا باب

جیسا دیس دیا بھیس، وہی گھر تھا اور وہی گھر کے لوگ۔ مگر ایک ساجدہ نے حالات میں آسان وزمین کا فرق کر دیا اور سوا ضمیر کے کوئی متنفس ایسا نہ رہا جو صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے نماز اور تلاوت کلام امدد نہ کرتا ہو۔ مغلائی خدا اس کی روح کو نہ شرما ئے خسیں نہ بھی خیرات بھی کرتی تھی اور زکوٰۃ بھی دیتی تھی نہ نماز اس کی ذات سے صرف خوشامدیوں کو فائدہ تھا۔ جس نے اگر دو باتیں ملائیں اور جھوٹی سچی خوشامدی کی اسی کا کام بن گیا۔ ساجدہ دینے میں باس سے بڑھی ہوئی تھی مگر موقعہ دیکھ کر اور حالت پہچان کر۔ بے نمازن عورت سے تو وہ بات تک نہ کرتی اور تو اور حد یہ ہے کہ اگر دو چار دفعہ میاں کی آلتی سیدھی سن لیتی تو ایک آدھ دفعہ اپنا چھوٹا سا وعظ اس کو بھی سنا دالتی۔ المختصر چند ہی مہینہ میں ضمیر کا گھر ساجدہ کی بدولت خاصی چھوٹی سی مسجد بن گیا۔ ہر طرف سے اللہ اور رسول ہی کی آوازیں آتی تھیں۔ میاں بیوی میں سلوک اور محبت اختلاف جو جو کچھ ہونا چاہیے۔ سب ہی کچھ تھا۔ مگر خیال کی مخالفت کسی طرح کم نہ ہوتی تھی اور گو اس اختلاف نے کبھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی۔ مگر خیف سی بدرنگی اکثر ہو جاتی اور وہ اس طرح کہ ضمیر ہوا غری کو تیار کھڑا ہے۔ بیوی سے رومال مانگا۔ وہ اندک کی بندی سجدہ میں پڑی ہے۔ مجبور خود ہونڈ کر نکالا یا میلا ہی لیکر جانا پڑا۔ ساجدہ کو فخر غا ایسا کرنے کی مجاز تھی۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہمیشہ اس کو محسوس کیا۔ اور یہ کوشش کی کہ خدا کے

فرض کی ادائیگی شوہر کی خدمت میں رختہ نہ ڈالے۔ ضمیر کو بھی اس کا یقین تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ بعض دفعہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کر لیتا۔

دنیا میں کچھ بھی ہوا کرے۔ مگر قدرت کا قانون خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتا ہے۔ مغلائی کو مرے شاید ڈیڑھ یا پونے دو سال ہونے ہوں گے کہ ساجدہ ایک بچی کی ماں بن گئی اور دوسرے ہی سال دوسری بچی کی۔ یہ دونوں بچیاں زاہدہ اور شاہدہ اگر وادی کی زندگی میں پیدا ہوئیں تو شاید ساجدہ ایک خاص حد تک ان کی پرورش سے مسکدوش ہو جاتی۔ لیکن اب ماں تھی تو وہ اور وادی تھی تو وہ۔ ضمیر اپنے خیالات میں ہمیشہ مست رہنے والا شخص تھا اتفاق کی بات ہے ایک روز وہ مغرب کے وقت ٹینس کھیل کر آیا تو بیوی بڑی بچی کو گود میں لئے باہر کھڑی تھی زاہدہ اس وقت خاصی ڈیڑھ برس کی تھی باپ کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ ہلک کر ہاتھ پھیلائے۔ باپ کا خون بھی جوش میں آیا اور گود میں لے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ ڈیڑھ برس کی بچی کی بساط کیا تھی۔ ٹوپی کا پھندا نا کچھ کربانغ باغ ہو گئی اور کپڑے لگی۔ ٹوپی باپ کے سر سے اتر کر بچی کے ہاتھ میں آئی اور زمین پر گر کر مٹی میں بھر گئی۔ غلطی خود ضمیر کی تھی جیسے بچی نے ٹوپی لی تھی نہ لینے دینا یا لے کر پھر اوڑھ لیتا اس وقت تو خاموش ہو گیا۔ مگر جب نیچے گری اور مٹی میں بھری تو البتہ تیوری پر بل آگیا اور یوں کیوں ہی مٹی میں مٹی کیچڑ میں بھری ٹوپی لے بچی کا اور ٹوپی کو بیوی کے سامنے لاکر پھینکا۔ ڈیڑھ برس کی بچی اپنے مطلب کے لئے دنیا بھر کی باتیں بگھارنے کو موجود کھانا یہ مانگے۔ پانی یہ طلب کرے۔ ٹکلیا اسے مانگنی آئے مگر ٹوپی کو ٹوپی نہ سمجھے۔ لیکن اس معصوم کا کیا قصور۔ جیسا اٹھایا ویسی اٹھی جیسا سدھایا ویسی سدھی۔ بچہ ماں کے پیٹ سے کچھ سیکھ کر نہیں آتا۔ جس رستہ پر ڈال دیا پڑ گیا۔ تم جیسی قابل ماں کی گود سے جو زمانہ کو پہچانے نہ وقت کو دیکھے جتنے

تبرئین اور پھوٹنے کے پیدائشوں۔ درست اور ٹھیک۔ خیر ایک کاستیاناں تو ہوتا تھا
جانو اور یہ بد نصیب جانے۔ اس کی تقدیر پھوٹی تھی پھوٹی۔ مگر مہربانی فرما کر
چھوٹی کی پرورش میں دخل نہ دینا۔ جس طرح میں چاہوں گا پال لوں گا اور پلوں گا
ضمیر کا اتنا اشارہ ساجدہ جیسی عورت کے لئے کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ
تھا۔ اس لئے میاں کی بات گرہ میں باندھ لی اور شاہدہ سے دودھ کے سوا کوئی واسطہ
نہ رکھا۔ باپ نے ایک نرس اور ایک کھلائی مقرر کر دی تھی۔ دن رات ان کے ہی پاس
رہتی۔ صبح اپنے سامنے اس کو غسل کروانا۔ کپڑے بدلوانا۔ ناشتہ کروانا۔
دوپہر کو اپنے روبرو اس کو سبق دلوانا۔ پچھلا سنا آگے پڑھوانا۔ شام کو اپنے
ساتھ ہوا خوری کو لے جانا۔ سیر دکھانا۔ کچر سنانا۔ باتیں بتانا۔ آنکھ بند کر کے
دن بھل گئے زائدہ دسویں اور شاہدہ نویں سال میں تھی۔ کہ ایک روز شام کے
وقت ضمیر شاہدہ کو لئے سیر سے واپس آ رہا تھا۔ نرس بھی ساتھ تھی۔ برج کے
پاس آ کر گھوڑا بجنر کا اور اس بری طرح کہ نہ اپنے سے مرکانہ سائیس سے تھا۔
خدا کو کچھ بہتری کرنی منظور تھی۔ کہ جلدی سے ضمیر نے بچی کو نرس کی گود میں دیدیا
وہ پیچھے بٹھی تھی۔ جھٹ سے بچی کو لے کر ڈپری۔ گھوڑا اسی طرح چمک رہا تھا۔ مارا
چمکا را ڈانٹا ڈپٹا۔ مگر قابو میں نہ آتا۔ مجبور خود ضمیر بھی باگ چھوڑ کر دور۔ الگ جا کھڑا
ہوا۔ ضمیر کے کودتے ہی گھوڑا گاڑی سمیت نالی میں گھوڑے کے بھی جھٹ آئی۔
گاڑی بھی چڑا ہو گئی۔ مگر جان بچی لاکھوں پائے۔ ضمیر کی نگاہ میں اس واقعہ کو خدا سے
مطلق واسطہ نہ تھا۔ اس نے نرس کو جو عیسائی تھی۔ سلامتی پر بہت بہت مبارکباد
دی بچی کو اٹھا کر پیار کیا۔ مڑ کر دیکھتا ہے تو کیکر کے درخت کی جڑ میں ایک اپاج اپنے
زخم کبل سے چھپائے پڑا ہوا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ تیوری پر بل ڈال کر آگے بڑھنا
چاہتا تھا۔ کہ اپاج نے کہا۔

”کچھ دے“

ضمیر کو سخت اور شاہدہ کو بہت ہی سخت ناگوار ہوا۔ ابھی باپ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ شاہدہ بولی ”کس قدر بدتمیز آدمی ہے۔ ہم سے مانگنے کا اس کو کیا حق حاصل ہے؟“

ضمیر۔ ان لوگوں میں بیکار رہتے رہتے یہ عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے کام بھی دوسروں پر ڈالیں۔ کم بخت اپنا حق سمجھتے ہیں اسی واسطے لندن میں بھیک مانگنے کا حکم نہیں ہے ہر شخص خواہ وہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو محنت کرے اور پیٹ پالے۔

شاہدہ۔ ان کی اس بے حیائی کے ذمہ دار ہم ہی ہیں اگر ان کو جھڑکیں اور ان کو خود مصیبت اٹھانی پڑے تو یقیناً ان کی عادتیں چھوٹ جائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ابھی کوئی بیوقوف مسلمان اوھر سے نکلیں گا تو پیسہ کیا کھانا تک ان کو کھلا دیگا؟

پاج۔ آپ میرے قریب آئیے میرے زخموں کو ذرا دیکھئے

مجھے سخت تکلیف ہے۔ بھوک کے مارے مر رہا ہوں ہونٹوں پر پھیپڑیاں بندھی ہوئی ہیں اور کل شام سے پانی اور کھانے کو ترس رہا ہوں اب میری حالت رحم کے قابل ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ ہل سکوں بخارج چڑھا ہوا ہے کروٹ لے نہیں سکتا۔ میں نے آپ کو مسلمان سمجھ کر پیسہ مانگا تھا۔

ضمیر۔ تیرے زخم دیکھ کر اپنی طبیعت بگاڑ دیا، حالانکہ اس کے خیال سے میرا جی متلانے لگا۔ حیرتی نبض دیکھوں۔ بخارج کا پتہ لگاؤں۔ چاہے وہ مرض متعدی ہی کیوں نہ ہو۔ تیرے جسم کو ماتہ لگاؤں خواہ خود ہی میں بیمار پڑ جاؤں۔

شاہدہ۔ چلے بابا چلے اس بات مت کہئے۔

گاری لوٹ چکی تھی اور سائیس بھی زخمی ہوا تھا۔ دو فصل باپ بیٹیاں اور نرس پاؤں

پیدل گھڑے۔ ساجدہ نے جب یہ واقعہ سنا تو میاں سے یا بیٹی سے تو کچھ نہ کہا وضو کر دو نفل شکرانہ کے پڑھے اور اسی وقت دس بچوں کا کھانا تیس خانہ میں بھیجا آدمی کھانا لے جا رہا تھا کہ ضمیر نے بھی دیکھا۔ ہنسنا اور بیٹی سے کہنا تم دیکھ رہی ہو تمہاری جاہل مایکا تماشے دکھا رہی ہیں۔

شہادۂ جی ہاں وہ ان تمام باتوں کو خدا کی طرف سے سمجھتی ہیں۔
ضمیر۔ مگر کوئی اس نیک بخت سے پوچھے کہ بیوقوف ان باتوں کا خدا سے واسطہ کیا۔ اگر جان خدا نے بچائی تو گھوڑے کو بھی اسی نے بھڑکایا۔ فرض کرو میں نہ کوڑتا اور تم کو نرس لیکر نہ اتر جاتی تو کیا تمہاری ماں کا خدا اس وقت بھی بچا لیتا۔ افسوس یہ ہے۔ کہ جاہل مانے بڑی سچی کا بھی اپنے ہاتھ تھام لیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ خیالات کے اعتبار سے دوسری ماہی وہی جہالت وہی لغویت اور وہی حماقت ہے۔

اس واقعہ کو تیسرا مہینہ ہوا ہو گا۔ کہ جاڑوں کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت ساجدہ کو ٹھکے پر نماز ظہر وہ پ میں پڑھ رہی تھی۔ اور زاہدہ ساتھ تھی دونوں مابینیاں نماز پڑھ چکیں تو ساجدہ نے نیچے کے گھروں میں ایک نظر ڈالی۔ ضمیر کی کوٹھی کے پاس ایک چھوٹا سا محلہ آٹھ گھر سے کے نام سے مشہور تھا۔ جس میں کچھ غریب اور بد نصیب لوگ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ ساجدہ کی نظر ایک بیمار پر پڑی جس کے سر لانے ایک عورت بیٹھی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔ مریض کا مکان دیوار سے ملا ہوا تھا۔ اور والان جہاں مریض کا بستر تھا بالکل آنکھ کے سامنے اس میں صرف تیلی عورتیں تھیں ایک بڑھیا ایک رانڈ دوسری کواری بیٹی۔ ان کے سر پر کوئی مرد نہ تھا اور بسر اوقات کا سلسلہ درزی کی سلامتی اور گوٹے کی مزدوری تھی۔ شریفیت لوگ زمانہ کو جانتے۔ اور وقت کو پہچانتے تھے۔ جو پڑی وہ جھیلی جو آئی وہ اٹھائی۔ جو میسر آیا وہ کھالیا جو گلگیا وہ بھر لیا۔ بڑھیا تھی تو غریب بلکہ فقیر مگر اس آن کی عزت اور نشان کی آدمی کہ سوال

یا طلبی تو در کنار یہ سن کر اور سمجھ کر کہ ساجدہ کے ہاں خیرات ہو رہی ہے کبھی گھر کی ہوا تک نہ نکلنے دی۔ ساجدہ ٹنکنکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ بڑھیا جاننا پر بھی اور بیوہ بہن کواری بہن کے پاس خون کے آشوگرار ہی تھی۔ اس کی مفارقت کا خیال اس کی موت کا یقین اسکی وداع کا احتمال کلبجے پر برے لگتا تھا۔ سردی سخت تھی اور ہوا تیز۔ شام قریب تھی اور رات سر پر بیمار بچی جس کے بدن پر اب بھی ایک پھٹی سی دلائی کے سواری کا کپڑا نام کو نہ تھا نمونیا میں بیہوش پڑی تھی۔ ماٹھی اور دوا کے بدلے اسکا منہ کھول کر دوا دم کی۔ آٹھ سے آشو کی لڑیاں برہی تھیں۔ دو اکیواسے پتے۔ پاس نہ تھا۔ رات تینوں دموں پر صاف نکل چکی تھی۔ اور دن بھی اس فاقہ میں ختم کے قریب تھا کہ بیمار نے آٹھ کھولی اور کہا بھوک لگ رہی ہے۔ کلیچہ بچ رہا ہے۔ دو نیچے دودھ کے دید و مانے بیٹی کی آواز سنی اور قریب پہنچ کر اس کے منہ پر ہاتھ پھیرا اور رو کر کہا "بیٹی پیہ نہیں ہے رات سے اندھ ہی اندھ ہے بیمار نے کچھ جواب نہ دیا کہ درزی نے آکر کہا لاؤ کرتہ دسے دوا۔

بڑھیا۔ "بھائی ابھی نہیں ہوا۔ بچی بیمار ہے۔ اس کی بیماری میں دونوں لگے ہوئے ہیں اندھ چاہے کل ضرور بے جا۔"

درزی۔ "کل ہا کرتے والا میلہ میں کیا بہن کر جائے بچی بیمار ہے تو جوتی کے صدقہ سے یہ پیسے جو پہلے دیدے وہ مفت کے تھے۔ تم جو بڑی بے غیرت کہ زبانی باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ لاؤ بس میرا کرتہ یوں کا یوں ہی دیدو اور اب شریعت ہو تو مجھ سے کپڑا نہ لینا۔"

بڑھیا۔ "بیٹا قصور تو ضرور ہو گیا۔ مگر معاملہ ایسا ہی تھا۔ بچتی کے بچنے کی امید نہیں ایک پیہ دوائی ٹھنڈائی کو نہیں آج رات کو جس طرح ہو گا بڑی سے تیار کر دے گی۔"

درزی۔ "بس زیادہ باتیں نہ بناؤ آئیں بڑی نمازی۔ پرہیزگار۔ دنیا بھر کی جھوٹی

مکڑا سیدھے ہاتھ سے گرتے اور دو آنے کے پیسے ادھر رکھ ۛ

بڑھیا۔ بیٹا پیسہ تو ہے نہیں گرتے حاضر ہے چاہے چھڑو چاہے لے جاؤ۔
درزی۔ میں نے تجھے جیسی سینکڑوں دیکھ لی ہیں۔ پیسے ادھر رکھ دے۔

بڑھیا باتیں کر رہی تھی۔ کہ بڑی بچی نے گھبرا کر آواز دی ”اے بی اماں۔ ادھر تو

آؤ دیکھو تو سہی اسے کیا ہو رہا ہے اس کے تو ہاتھ پاؤں مڑ رہے ہیں ۛ

بڑھیا۔ ”اے کیا کروں۔ اے بچی خدا کے لئے آنکھ تو کھول۔ ننھی لے پانی

تو پی۔ اس کے دانت بند ہو گئے۔ پانی کیونکر ڈالوں ۛ بچہ بھی تو نہیں دے ۛ

درزی۔ شے کی بچی میں تیرے باوا کا نوکر ہوں کہ دکان چھوڑے تیرے

گھر پر کھڑا رہوں لا جلدی سے گرتے اور پیسے ۛ

بڑھیا۔ ”بیٹا امٹ کی قسم پیسے تو نہیں ہیں۔ گرتے یہ لیلو یہ بٹشتری لیلو دو آنے

کے بدلے ۛ

درزی۔ ”دیکھو ۛ یہ بٹشتری تو چار پیسہ کی بھی نہیں ہے۔ رنگ میں ڈوبی رنگ

میں لتھڑی ہے کس کام کی ۛ

بڑی لڑکی۔ ”اچھی اماں خدا کے واسطے آؤ یہ تو منہ کھول رہی ہے۔ پانی تو

پکا دو۔ ۛ

بڑھیا۔ ”بیٹا میں اور پیسے تم کو دیدوں گی۔ تم اب جاؤ۔ ۛ

درزی گرتے اور بٹشتری لیکر ادھر گیا۔ بڑھیا ادھر آئی۔ تو مٹی کے آبخوڑے سے پانی بچی کے

حلق میں ڈالا۔ ساجدہ اوپر کھڑی یہ تمام واقعہ دیکھ رہی تھی۔ اور زاہدہ کو دکھا بھی رہی

تھی۔ جب پانی بیمار کے حلق سے زیادہ اُس کے اوپر گرنے لگا اور اُس نے کراہنا شروع

کیا۔ تو وہ بچی کو لئے نیچے اتری تو ضمیر بیٹھا ہوا شاہدہ سے کھیل رہا تھا۔

بیوی۔ ”میں خدا آٹھ گھرے تک جانا چاہتی ہوں۔ ہو آؤں ۛ“

ضمیر کیوں خیریت۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہوئی؟

بیوی۔ ”نیم والی بڑی بی کے اں جاؤں گی“

ضمیر۔ ”وہ فقیر فی فکر گدی مغرور اتنی کہ بھوکی رہے اور یہاں اگر جھانکے تک نہیں وہاں تمہارا جانا ہرگز تمہاری شان کے لائق نہیں۔“

بیوی۔ ”یہ ٹھیک ہے مگر اس وقت تو تم تجھ کو اجازت دیدو“

ضمیر۔ ”ایسی ہی ضرورت ہے تو چلی جاؤ۔ مگر اپنی عزت کو خود نہ سنبھالو گی تو یاد رکھو نوکر وں تک کی نگاہ میں ذلیل ہو جاؤ گی۔ اس کا تو نصیب کھل جائے گا۔ کہ تم وہاں گئیں مگر تمہاری عزت میں فرق آئیگا“

بیوی۔ ”تم اجازت دے رہے ہو تو اس بحث کو جانے دو“

ضمیر۔ اچھا جاؤ چلی جاؤ۔

بیوی۔ ”تم ذرا ڈاکٹر کو بلا دو اور وہیں بھیج دینا۔“ ڈولی منگو لاچی کو ساتھ بٹھا

بڑھیا کے پاس آئی۔ دروازہ میں کھڑے ہو کر پوچھا ”میں آجاؤں؟“

دونوں ماں بیٹیاں سکتے میں رہ گئیں۔ آخر بڑھیا نے کہا ”ہاں بیگم آجاؤ۔“

ساجدہ اندر پہنچی تو بیٹھنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ بڑھیا نے لپک کر اپنا پرقعہ بچھا دیا اور کہا بیگم اس پر بیٹھ جاؤ۔ ہمارے ماں کوئی چیز آپ کے لائق تو ہے نہیں آپ نے مجھے وہیں بلوایا ہوتا۔ میں آجاتی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔“

ساجدہ۔ ”تکلیف کی کیا بات ہے یہ چھوٹی بچی کیا بیمار ہے؟“

بڑھیا۔ ”بیوی کیا بتاؤں۔ اگلے جمعہ کو صبح کی نماز خاصی اچھی طرح پڑھی۔“

سر حرکت رہا تھا۔ کہنے لگی ”تہاؤں۔“ میں نے کہا ”اچھا۔“ ٹھنڈے پانی سے نہانی نہا کر

اٹھی تو پسلی میں درد تھا۔ پھر بخار چڑھا۔ جب سے یوں ہی بے سہرت پڑی ہے“

ساجدہ۔ ”آپ نے کچھ دوا وغیرہ پلائی“

بڑھیا۔

یہ باتیں ہوسہی تھیں کہ ڈاکٹر آگیا۔ پردہ ہوا۔ دیکھا۔ نسخہ لکھا۔ دوا آئی اور اپنے سامنے دو دو گھنٹے بعد ساجدہ نے دو عورائیں پلائیں۔ چلتے وقت دس روپیہ نقد دیئے اور کہائیں صبح ہی پھر آؤں گی۔

جس وقت ساجدہ اور زاہدہ ڈولی میں بیٹھنے لگیں تو بڑھیا پاس کھڑی تھی شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر زبان نہ اُلتی تھی۔ آنسوؤں کا ایک تار تھا جو ساجدہ کی عنایت کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ شام کو سب سے پہلے چار آدمیوں کا کھانا سیر بھی دووہ اور تین کھاف بڑھیا کو بھیجے۔ دوسرے روز جب ساجدہ گئی ہے تو بیمار کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہفتہ بھر تک برابر دوا جاری رہی اور لڑکی تندرست ہو گئی۔ بڑھیا نے ساجدہ سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر اسکی ماسے جاکر جو کچھ کہا اس کا اثرا اٹا ہوا کہ اُس نے فوراً بیٹی کو یہ خط لکھا :-

ساجدہ بیٹی کو ماں کی طرف سے بہت بہت دعا۔ آج نیم والی بڑی بی آئی تھیں جس طرح انہوں نے تمہاری تعریفیں میرے سامنے کیں اور جس دل سے دعائیں دی تھیں۔ میں تمہارے سامنے بیان نہیں کر سکتی۔ کیا بناؤں کس قدر غوشی ہوئی ہے۔ انسانیت کی یہ ہی معنی ہیں اور دولت کی یہی تعریف ہے کہ حاجتمندوں کے کام آئے۔ اور غلو کو مدد دے زندگی اسی کا نام ہے اور اسلام اسی کو کہتے ہیں۔ کہ انسان ہر رنگ میں اور ہر حال میں موت سے غافل اور انقلاب سے بے خبر نہ ہو۔ تم گئیں تمہارا جانا معمولی بات تھی۔ مگر نہیں تم نے ایک دل فتح کیا۔ ایک مسلمان کے کام آئیں۔ تم نے ایک ج کید ایک گرتے ہوئے مکان

و ایک اُجر طے ہوئے دل کو تعمیر کیا۔ آبا و کیا۔ تم نے نہ سنا ہو
 نہ دیکھا ہو لیکن تمہارے قدم پر تمہارے ہر سانس پر ایمان کے
 فرشتے مرجہا کے نعرے لگاتے تھے۔ تم نے ایک قرض تم نے
 ایک امانت اس کو دی اس کے پاس رکھوادی جو سچا مہاجن اور
 پورا این ہے اور جس وقت ہر متنفس نفسی نفسی پکار رہا ہوگا تمہاری
 یہ خدمت تمہاری یہ امانت تم کو واپس لیگی۔ تم بڑھیا سے بہت
 زیادہ عاجز ہو گئی۔ بیمار سے بہت بڑھکر مضطرب ہو گئی۔
 یہاں تین عورتیں ایک گھر میں تھیں۔ وہاں سب ہوں گے اور کوئی
 نہ ہوگا مجھ جیسی ماں جو صورت کی عاشق زار ہے۔ منہ پھیر لے گی۔
 اور ساجد حبیباً باپ جو مرتے مرتے گلے لگاتا رہا اُٹھا کر بھی
 نہ دیکھے گا پ

پیاری بیٹی تمہاری ہستی کیا تھی۔ اس احکم الحاکمین نے اپنی قدرت
 سے اپنی عنایت سے تم کو دولت دی۔ یگم بنایا۔ کیوں اسلئے
 کہ دولت دے کر دیکھے۔ اور حکومت دے کر آزمائے۔ جو کر رہی
 ہو اس میں فرق نہ آئے اور جو سمجھ رہی ہو اس میں کمی نہ ہو۔ زندگی
 کے ساتھ موت۔ صحت کے ساتھ علالت، اتمول کے ساتھ عشرت
 لازمی اور یقینی ہے کوئی فعل ایسا نہ ہو جائے کہ بعد میں پچھتاؤ۔ مصلحتی
 ہوں کہ نماز گنڈے دار ہو گئی۔ خدا کی قسم ساجد بہت رنج
 ہوا۔ میرے دودھ کو یہ آگ لگی۔ کہ مسلمان کی بیٹی۔ ہٹھی کٹی موٹی تیزی
 اذان بٹنے اور پان کھائے۔ یہ عزت ہمیشہ یہ دولت سداور یہ زندگی
 زیادہ دیر رہنے والی نہیں۔ موت سر پر موجود ہے اور پہونچا ہے اس

گھر میں جہاں عزیز اور غیر کوئی بھی کام نہ آئے گا۔ اندھیرا گھپ ہوگا۔
سانپ بچھو کیڑے۔ کھٹکھوڑے اس جسم کو جو آج خدا کے سامنے جھکتے
ہوئے چمکاتا ہے چھلنی کر دیں گے۔ وہاں یہ نماز ہی ایسی
چیز ہوگی جو اندھیرے کو اجالا اور قبر کو روشن کر دے گی۔ دنیا کے
بہت سے مرحلے دیکھ لئے کو اربہ سے دہن نہیں۔ بیوی سے ما
بنیں۔ لڑکی سے گھر والی بنیں۔ لیکن ابھی کچھ اور بننا ہے
اور وہ سب سے پیچیدہ اور سب سے نازک مسئلہ ہے۔ ساجدہ
اس وقت کو نہ بھول اور تیار رہ ہر وقت اس امتحان کے، اس
جواب کے۔ اس عذاب کے واسطے جو موت کے ساتھ ہی شروع
ہو جائے گا۔

ساحرہ کا لڑکھانہ پانچواں باب

اضمیر شاہدہ کی پرورش میں دن رات مشہمک تھا اس نے اپنی دانست
میں اپنی بساط کے لائق اور اپنی حیثیت کے موافق کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کھلانے
کے واسطے نرس۔ پڑھانے کے واسطے مس۔ مشن میں تعلیم اس نے دلائی۔ میموں
کی صحبت میں اس نے رکھا۔ مختصر یہ کہ صبح سے شام تک صرف تعلیم کی کوشش
اور اصلاح کا ضبط تھا۔ ما سے اس کا واسطہ ہمیشہ ہی برائے نام رہا۔ ہنسیار
ہوئی تو بس اتنا تعلق ضرور تھا کہ مدرسہ جاتی دفعہ اور آتی دفعہ کھڑے کھڑے دوچار
باتیں۔ درنہ ایک علیحدہ کمرہ جو باپ نے اس کو دیدیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ بلا اجازت
کوئی نہ جانے پائے۔ رات بھر اس میں رہنا اور جو جی میں آئے وہ پڑھنا۔ برخلاف
اس کے زاہدہ ماں کی دوسری تصویر تھی۔ غرض ایک بیٹی باپ کی اور ایک بیٹی

یہ ضمیر کی کھلی ہوئی زیادتی اور علانیہ حق تلفی تھی کہ چھوٹی پرائس فیاں اٹھانا اور اُراف نہ کرتا۔ اور بڑی کو چھوٹی کوڑی نہ دیتا اور ہر وقت جلتا۔ اسکی عادت کی ہسکی خصلت اس کی باتیں اس کی صورت ہر چیز ظالم کو زہر معلوم ہوتی تھی۔ شاہدہ کے ساتھ ساجدہ کا یہ سلوک نہ تھا اسکو دونوں آنکھیں ایک تھیں وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ جو چاہے کھا سکتی اور منگوا سکتی ہے۔ لیکن جب اس نے کسی چیز کا حصہ کیا تو وہی شرعی آدھا اس کو آدھا اس کو ۴

زاہدہ چودھویں اور شاہدہ تیرہویں برس میں تھی۔ کہ ایک روز شاہدہ کو اپنے کمرہ میں ڈر لگا۔ سوتے سوتے کچھ ایسی ہیبت بیٹی کی گھگھی بندھ گئی۔ کمرہ اکیلا تھا ماں اتفاق سے جاگ رہی تھی۔ اٹھی، گئی دیکھا تو واقعی بچی تھرتھر کا نپ رہی جو ہشیار کیا تو جاگی۔ مگر ڈر کچھ ایسا بیٹھا تھا کہ بات نہ کر سکتی تھی۔ میاں کو بلوایا تو اس نے کہا سینہ پر ہاتھ پڑ گیا ہوگا۔ دوسری کروٹ سے سلا دو

بیوی۔ میں تو اب اس اکیلے کمرہ میں نہ سونے دوں گی۔ اگر میری آنکھ نہ کھلتی تو کیا ہوتا وہاں لیجا کر سلاؤں گی یا آپ یہاں سوؤں گی

میاں۔ نہ تمہاری یہاں سونے کی ضرورت نہ اس کے وہاں جانے کی بس تم جاؤ سوؤ، ۵

بیوی۔ اچھا تو بیٹی تو آیت الکرسی پڑھ لے۔ مگر ہاں تجھے آتی ہی کہاں؟

میاں۔ ایسی ہی کرسی کی ضرورت ہے تو میں کرسی لا دوں۔ وہ رکھ دو

بیوی۔ تو بہ تو بہ تمہارے ایمان کو کیا ہو گیا؟

ضمیر باہر چلا گیا شاہدہ سو گئی۔ ساجدہ آکر لیٹی تو سب سے پہلے اس کو میاں کی اس کرسی کا خیال آیا کہ ان کے ایمان کو کیا ہو گیا۔ آیت الکرسی کا ایسا مضحکہ تو بہ کی زبانوں پر کس طرح اصلاح کروں کسی طرح خدا یاد نہیں آتا۔ اس کے بعد بیٹی کی گھر ہی

کا جھکڑ بندھا کہ مسلمان کی بیچی درود شریف اور کلمے سے واقف نہ ہو اس کا عذاب گھو مجھ پر پڑیگا۔ اور سب باتوں کو جانے دو نماز بھی تو نہیں آتی۔ اے کیا ہو گیا۔ اور کیا کروں گی۔ ان خیالات میں اس قدر محو ہوئی کہ نیند صاف اڑ گئی ہر چند چاہا کہ کسی طرح سوؤں۔ مگر کسی کروٹ چین نہ پڑتا تھا۔ اٹھی چپکے سے کمرہ میں گئی اس کے سر پرانے کھڑی ہوئی آہستہ آہستہ آیت الکرسی پڑھی اور حصار باندھ کر چلی آئی۔

دونوں بہنوں کی جس طرح تربیت میں بعد المشرقین تھا اسی طرح خیالات میں بھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چھوٹی نہ صرف بڑی کو جاہل۔ پھو ہڑیے وقوف اور ناکارہ سمجھتی تھی۔ بلکہ اس سے بات کرنی بھی کچھ کسر شان سی سمجھتی تھی۔ یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ زاہدہ شاہدہ کے کمرہ میں گئی ہو۔ یہ کئی دفعہ ہوا کہ کسی ضرورت سے یا محبت سے کوئی بات اس نے بہن سے کی اور وہ جھٹ سے اپنے کمرے میں گھس گئی زاہدہ کو ناگوار تو ہوتا۔ مگر نہ اتنا کہ دل میں بل بھر کر بیٹھ جائے لیکن اس میں کلام نہیں کہ اگر زاہدہ ایک دفعہ بھی ایسا کرتی اور بہن کی بات کا جواب نہ دیتی تو شاہدہ وہ دکر لڑکی اور کینہ و زنجی تھی کہ شاید عمر بھر بہن کی صورت نہ دیکھتی و

ایک پیٹ کی دو بچیاں اور ایک باپ کی دو لڑکیاں۔ ایک گوشت ایک پوست مگر تربیت کے متفرق اثرات نے دونوں کے خیالات میں اتنا کچھ فرق کر دیا کہ ایک مشرق میں تھی تو ایک مغرب میں۔ زاہدہ موزن کی اذان کے ساتھ اٹھتی باوجود ایک چھوڑ دو دو ماماؤں کے اگر کسی کی آنکھ نہ کھلتی تو اپنے ہاتھ سے پانی گرم کر لیتی گرمی ہوتی تو خود ہی ٹھلیا بھر سب سے پہلے نہلاتی اس کے بعد نماز پڑھتی اور کلام امد میں مصروف ہو جاتی۔ اس سے فانی ہو کر خود کمروں میں بھاڑ دیتی یا اپنے سامنے دواتی اور پھر باورچی خانہ میں جا پہنچتی اور ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ شاہدہ صبح آٹھ بجے سو کر اٹھتی اور بچھونوں میں لیٹے لیٹے چائے بسکٹ کھاتی۔ بہن ناشتہ

ہو جاتا۔ تو اٹھ کر منہ ہاتھ دھوتی۔ نگلی چوٹی کرتی اور مشن کی کتاب رٹنی شروع کر دیتی۔ دس بجے کے قریب مدرسہ چلی جاتی۔ بارہ مہینے کی بیماری اس کے پیچھے ایسی لگی تھی کہ کوئی دن بغیر شکایت کے بسر نہ ہوتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ محنت کرتی و مشقت گھر کے کام کاج سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

شاہدہ کی بیماری سے ماں اور باپ دونوں پریشان رہتے تھے ساجدہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ جو اقتاد پڑ گئی وہ اچھی نہیں۔ بھلا کو اربہ کی عمر بے فکری کا زمانہ۔ آزادی کے دن۔ اس وقت بیماری کیسی۔ اگر اب بھی بڑی کی طرح چلنے پھرنے لگے تو چار دن میں گھوڑا اسی دوڑے لگے میاں کی وجہ سے ہوں نہ کر سکتی تھی ؟

چھٹا باب

اب تک تو ساجدہ کو شاہدہ کی تربیت کا رونا رہا۔ مگر اب خدا نے دو لڑکیوں کے ساتھ ایک بیٹی کی ماں بھی بنا دیا۔ لڑکے کی پیدائش سے ضمیر کو جقدر خوشی ہوئی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ چھ دن اور رات دوستوں کے جلسے رہے۔ ناچ ہوا۔ گانا ہوا۔ ڈنر ہوا۔ پارٹیاں ہوئیں۔ جس روز ساجدہ چھٹی نہائی ہے۔ اس روز بچہ کا عقیقہ تھا اور اس نے تمام رشتہ دار عورتوں کے ساتھ ضمیر کی چچا زاد بہن اپنی نند کو بھی بلایا تھا۔ جمان جمع ہو گئے تو عقیقہ ہوا۔ اس کے بعد ساجدہ نے کند سے کہا ”آؤ“

بواللہ و صلاؤ۔ اور بچہ کو اپنا کرتہ ٹوپی پہنا کر منہ میں دووہ دو۔ شاہدہ پاس کھڑی تھی۔ ماں کا یہ فقرہ سن کر مسکرائی اور جب پھوپھی نے اپنا کرتہ ٹوپی پہنا کر یہ رسم ادا کی تو ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگی۔ ساجدہ کو ناگوار تو بہت ہوا۔ مگر اس وقت سب کے سامنے کچھ نہ بولی۔ جب عقیقہ ختم ہوا۔ اور لوگ چلے گئے۔ ضمیر اندر آیا۔ تو ماں کے سامنے ہی شاہدہ نے باپ سے کہا۔

”بابا آپ نے دودھ دھلائی کی رسم نہ دیکھی۔ نہایت پر لطف تھی۔ اما جان کا۔ دودھ دودھ سے دھویا گیا اور پھوپھی جان کو اسکے بدلے روپے دے گئے وہ چپکے سے لیکر چلتی ہوئیں کرتہ ٹوپی زیادہ سے زیادہ پانچ چھ روپے کا ہوگا۔ مگر کچھ ان کو ملا وہ اس سے بہت زیادہ تھا۔ یہ بھی بہت اچھی تجارت ہے۔ وہ کہتی ہونگی کہ روز بیٹے ہو اکریں“

ضمیمہ۔ بیگم تنہا ہی تو ہر حرکت میں مصلحت ہوتی ہے۔ ہمیں بھی تو بتاؤ آخر اس تجارت میں کیا منفعت تھی؟

ساجدہ میاں کے سوال کا کچھ جواب دینے نہ پائی تھی کہ شاہدہ نے کہا اس کی منفعت میں آپ کو بتا دوں۔ دودھوں نہاے پوتوں پھلے۔

ضمیمہ۔ دھنسر ”ہاں بیٹی ماں۔ دودھ سے تو اسی لئے دودھ دجوا ہوگا مگر پوتوں پھلے کیونکر ہوا؟“

شاہدہ۔ وہ اس کے آگے محذوف ہے۔ دودھ ہی سے پوت بھی ہوتا ہے واہ بی اماں جان۔ زمانہ اتنا ترقی کر گیا۔ مگر شاباش ہے کہ آپ کے کان پرجوں نہیں چلتی۔ یہ رسوم جنہوں نے ہمارا خاتمہ کر دیا۔ افسوس اب تک ہمارا بیچا نہیں چھوڑتیں۔ جو روپیہ آپ نے ان کو دیا اگر وہ کسی قومی کام میں صرف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

ساجدہ کا چہرہ غصہ کے مارے سُرخ تھا۔ ایک رنگ آ رہا تھا۔ اور ایک جا رہا تھا۔ مگر بالکل خاموش تھی۔ ضمیمہ بیوی کا یہ حال دیکھ کر اور بھی چھڑنے لگا۔ اور پھر کہا ”ماں بیگم مصلحت نہ بتاتی؟“

ساجدہ۔ میں خاموش ہوں۔ اور اس گستان کے منہ لگنا نہیں چاہتی تم اپنے ساتھ اس کو بھی شہ دے کر شیر کرتے ہو؟

شہادہ۔ ”نہیں اماں جان یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ میرے کان میں آواز پڑی رہے تو آجی باپو سا جدہ۔ تمہارا اعتراض لغو۔ تمہارا مضحکہ غلط۔ تمہاری رائے جھوٹی تمہاری عقل خطہ۔ تم جس پر نہیں رہی ہو یہ انسانییت کا وہ جوہر ہے جس کی نہ میں چمکتے ہوئے موتی دمک رہے ہیں۔ تم نے دو چار زبانوں سے رسوم کی قباحات سن لی اور رٹ لی لیکن اصلیت کو نہ سمجھے کاش خدا تم کو عقل دیتا تو اعتراض سے پیشتر اور سننے سے پہلے سوچتے اور سمجھتے کہ کیا کیا اور کیوں کیا۔ سنو اور سوچو۔ سمجھو اور غور کرو۔ آج کچھ روز سے سینکڑوں روپیہ لغویات اور خرافات میں صرف ہو رہا ہے لیکن ایک پیسہ ایک کوزی۔ ایک وقت کا کھانا کسی ایسے شخص کو نہ دیا گیا جو مستحق تھا۔ تمہارے یا تمہارے باپ کے دل میں سینکڑوں ارمان ہزاروں خوشیاں۔ لاکھوں انگلیں پیدا ہوئیں۔ لیکن کبھی اس زبردست ہستی کی طاقت کا اندیشہ نہ پیدا ہوا۔ جو آنا فانا، کھلے ہوئے پھول نہکتے ہوئے پودے اور چمکتے ہوئے نئے اجاڑ سکتی ہے۔ جو کچھ ہم کو میسر ہو اسی خدا نے برحق کی عنایت اور رحمت سے ہمارا فرض تھا اور جب تک زندہ ہیں رہے گا۔ کہ ہر وقت ہر ساعت ہر لمحہ اپنی گردنیں اس کے حضور میں جھکائیں اور اس نعمت سے جو ہم کو دیتا ہے اور دے رہا ہے اسکو بھی دیں تاکہ ہمارے کاموں میں ترقی۔ ہماری مسرتوں میں اضافہ اور ہماری راحتوں میں برکت ہو۔ ہماری زندگیاں خالی خالی نہیں۔ ہر طرف سے فرائض اور حقوق میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ہمارا کام کھانا۔ سینا ہنسا اور بولنا ہی نہیں فرائض کی ادائیگی اور حقوق کی نگہداشت بھی ہے۔ ہم پر بہت سے حقوق ہیں۔ عزیزوں کے۔ پڑوسیوں کے۔ نوکروں چاکروں کے۔ غریب غربا کے۔ ادا ان کے۔ جو عزت میں۔ شرافت میں ہم سے کم نہیں مگر دولت اور ثروت میں ہمارے محتاج اور دست بگر ہیں۔ کیا یہ صحیح ہو

کہ ہمارے دسترخوان پر قورمے اور بریانی ہوں۔ لیکن ہمارے عزیز فاقوں سے بھوکے لگ رہے ہیں؟ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے جسم پر دیبا و حریر ہوں اور ہمارے پیارے پیوند لگائیں اور ننگے پھریں۔ ۛ

تم کو رسموں پر اعتراض ہے۔ تم کس منہ سے برا کہتی ہو تم تو اس سے بھی بدتر کام کر رہی ہو۔ رسوم کی قباحت اس اعتبار سے درست کہ روپیہ برباد نہ ہو۔ مگر تم نے تورات دن گچھرے اڑائے۔ کون سے طائفے تھے جو اس تقریب میں نہ آئے کیا اس میں سے کچھ روپیہ خدا کی راہ پر نہ اٹھ سکتا تھا؟

رسوم بیشک قابل اصلاح ہیں۔ مگر ان کنکروں میں جو ہر ریزے ان گدڑیوں میں لال اور اس سیاہی میں سفیدی بھی ہے۔ تم کو معلوم ہے ہماری کتاب مقدس ہم کو کیا حکم دیتی ہے ذَوِی الْقُرْبٰی سَبِّحْ پہلے ہم پر ہمارے عزیزوں کے حقوق ہیں۔ اور ہماری حالت یقیناً خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس قابل ہے کہ ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ سلوک کریں۔ اور ان کی ضرورتوں پر کام آئیں۔ میں نے کئی دفعہ تم کو اس طرف متوجہ کیا۔ مگر تم نے پرواہ نہ کی۔ میرا ایمان یہ ہے کہ جس طرح نجاست کا ایک قطرہ پانی کے بھرے ہوئے گھرے کو ناپاک کر دیتا ہے اسی طرح عطر کی ایک بوند غلیظ کمرہ کو بھی مکا دیتی ہے۔ اس تمام روپیہ میں جو صرف ہو اگر خدا قبول کر لے تو وہی ایک رقم جو میں نے تمہاری پھوپھی کو دی۔ اس قابل ہے کہ تمام اسراف کو پاک کر دے۔

یہ رسم جس کا تم نے مضحکہ اڑایا۔ منہنے کے قابل نہیں وہ کس شوق اور محبت سے کرتے ٹوپی لائیں۔ میرے اس سے بہت زیادہ قیمتی کپڑے موجود ہیں لیکن میرا کام یہ تھا کہ ان کا دل نہ توڑتی۔ اسی لئے میں نے بچہ کو اپنے کپڑے نہ پہنائے اور ان کا دل بڑھا دیا۔ ۛ

کیا تم کو اس سے انکار ہے کہ دودھ کی مالش سے زچہ کا دودھ بڑھتا ہے۔ طب کی کتابیں دیکھو۔ اپنی لیدی ڈاکٹر سے پوچھو۔ میں پڑھ بھی چکی ہوں اور پوچھ بھی اس فعل کو جو طب کے اعتبار سے نہایت مفید ہے۔ اگر اس صورت میں دُھال دیا تو کیا خرابی کی۔ تم کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ مگر مجھے خبر ہے کہ سلیمہ جس کے نیک پر تم کو اعتراض ہے۔ نہایت بد نصیب عورت ہے۔ بیوہ ہے دوستی ہیں اور ایک بڑھیا ماں اس کا حق یقیناً تمہاری کسائی میں ہے اور میں نے جو کچھ اس کو دیا ہرگز سرگز اس پر احسان نہیں بلکہ تم پر ہے کہ میں نے مواخذہ عاقبت سے بچایا ۴

ساتواں باب

کہنے کو اور کہنے کو کیا حقیقتاً دونوں بچیوں کے نکاح کا مختار باپ تھا اور گودہ ایک کا عاشق زار اور ایک سے قطعاً بیزار خسرو ع ہی سے تھا پھر بھی اُمید یہ تھی اور ایک دو کو نہیں سب کو کہ شادی کے معاملہ میں وہ جو کچھ کرے گا دیکھ بھال کر اور سمجھ بوجھ کر لاکھ ناغوش اور علحدہ سہی۔ مگر اپنی اولاد تھی۔ اور بد نصیب باپ کے گھر میں چند روز کی مہمان مناسب تھا دستور دنیا کے موافق اور حکم خدا کے موافق۔ کہ کجبت زیادہ نہیں اتنا اور بہت نہیں اس قدر سمجھ لیتا۔ کہ کواری پتم ہمیشہ رہنے والا اور زاہدہ سدا ٹھہرنے والی نہیں۔ یہ ساون کی چڑیا۔ برسات کا چھینٹا۔ صبح کی چاندنی اور ریت کی چمک ہے۔ وقت آ رہا ہے کہ یہ اس گھر کو ترسیلگی۔ اور میں نہیں تو میرے گھر کا کونہ کونہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی صورت کو دیکھنے گا۔ اور نظر نہ آئے گی۔ میں کہاں اور یہ کہاں۔ یہ بھی وقت کی بات اور محض اتفاق ہے کہ میرے غصہ کی نظریں اور تیوری کے بل دیکھ رہی ہے اور سہمہ رہی ہے۔ مگر سمجھتا تو اس وقت جب دماغ صحیح اور عقل درست ہوتی۔ خیر اس کا بھی مضائقہ نہیں اس دنیا اور اس جہان میں عقل مند بھی جیتے ہیں۔ بیوقوف بھی

ہشیار بھی رہتے ہیں مرل بھی۔ مگر یہ گنجت تو بیوقوف اور بیہودہ ہو کر ہمیشہ اور ہر حال میں اپنے نہیں عقلمند اور لائق سمجھتا تھا اس کو شاہدہ کی محبت تھی۔ اور معمولی نہیں بہت زیادہ۔ مگر اس میں بھی صداقت نہ تھی وہ صرف اس توقع پر اس کا فریفتہ تھا کہ یہ میری مرضی کے موافق اور خواہش کے بموجب تہذیب کا مخزن اور شہرت کا معدن ہوگی۔ بہر حال کیفیت یہ تھی کہ ایک آنکھ میں لہر بھر ایک آنکھ میں خدا کا قہر شاہدہ علی الاعلان کھلے خزانے جو چاہتی وہ کرتی۔ جو جی میں آتا کہتی۔ مگر وہ آف نہ کرتا۔ گھر کا رئیس البیت جب وہی بھلی اور بری سب دیکھتا اور جائز سمجھتا تو ناجائز سمجھنے کا حق کس کو اور ٹوکنے والا کون شاہدہ جو کچھ بھی کرتی کم تھا پردے کی پرواہ اسے نہ تھی بزرگوں کا ادب اسے نہ تھا۔ اور پھر لطفت یہ کہ ماسے لیکر بہن تک اور بڑے سے لیکر چھوٹے تک سارے گھر کو جاہل اور دقتناوی سمجھتی تعلیم تربیت۔ صحبت اکٹھی تین چیزیں تھیں جنہوں نے اس کو مغربی سائے میں ڈھالا ان پر طرہ باپ کی داو تھی۔ کہ ہر قول کو اور ہر فعل کو سر پر رکھتا اور آنکھوں سے لگاتا وہ ماں کے منہ درمنہ اور بہن کے سامنے ڈنکے کی چوٹ دونوں کو جاہل بناتی اور بیوقوف کہتی۔ ماغریب کے فرشتوں نے بھی اس ڈھنگ کی لڑکی دیکھی نہ سنی۔ جلتی جلتی انگاروں پر ٹوٹی اور آگ میں بھنتی۔ مگر جانتی تھی کہ سمجھانا بچھانا تو درکنار وہی بات بھی زبان سے نکالوں گی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ ایک کہوں نہ چار سنوں۔ ہم اس معاملہ میں قطعاً ساجدہ کو ہر عیب سے پاک اور ہر نقص سے دور دیکھتے ہیں۔ آخر شاہدہ بھی تو اسی کی بچی تھی۔ اسی گود سے اٹھی اسی دودھ سے پلی مگر دونوں میں آسان و زمین کا فرق اور مشرق و مغرب کا بُعد تھا۔ تمام ذمہ داری از ابتدا اتنا انتہا اسی بد نصیب باپ پر ہے۔ جس نے غیروں کی طرح آنکھوں پر پھیکری رکھ ایسا کالوں میں تیل ڈالا کہ رتی بھر پرواہ نہ کی۔ جوان قریب قریب، دونوں ہی بچی

تھیں۔ اب دونوں کا کوار پتہ ماں کے واسطے پوری مصیبت تھی۔ وہ لاکھ شاہد سے بے تعلق تھی۔ مگر ماننا کا کیا علاج کرتی۔ کہ صرف اس خیال نے کہ عمر بھر ڈھل رہی ہیں اور بر نہیں جڑتے اسکو کھانا پینا سب حرام کرو یا۔ رات اسی چکر میں ختم اور دن اسی اُدھیر بن میں پورا ہو جاتا۔ دو چار دفعہ میاں کو بھی متوجہ کیا مگر وہ بجائے اس کے کہ بیوی کے رنج میں شریک ہو کر یا کوئی اور معقول بات کہہ کر اس کو تسکین دیتا۔ جب بولا اُلٹا اور جو جواب دیا اوندھا۔ اور آخری فیصلہ یہ کیا۔ کہ تم شاہد سے بے فکر رہو۔ اپنی بچی کا انتظام کرو اس کا بھی ہو جائیگا۔ خدا کا شکر ہے روپیہ کی کمی نہ تھی۔ عزت بھی تھی اثر بھی تھا۔ ایک خرابی بی مغلائی کی تھی۔ تو روپیہ کے آگے ہڈی کو کون پوچھتا ہے۔ دولت نے اچھی طرح چھپا دیا۔ بات نہ آنے یا شادی نہ ہونے کی وجہ اور تھی اور معقول تھی۔ بی شاہد کے گن چھپے ڈھکے اور میاں کے کر تو ت ایسے ویسے نہ تھے۔ ایک دنیا میں شہرت اور ایک جہان میں ڈھکنج چکا تھا بیچارے اگلے زمانہ کے سیدھے سادے تو اس کا نام آتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہ زمانہ نے اچھی طرح بتا اور وقت نے پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ یہ نشہ جدید کی مثالیاں تقلیدِ غیر میں اتنی شرابور اور ایسی چکنا چور ہیں کہ میاں کو نکلوثی بندھو اگر بھی نہ چھوڑیں گی۔ یہ بارہ جہینے کی روگی۔ تیس دن کی سیار۔ کام کی یہ نہیں۔ کاج کی یہ نہیں۔ ہے اس رنگ کے شیدا ان کی خواہشیں بڑھی ہوئی۔ تناسیں پھیلی ہوئی۔ حسن کے منلاشی دولت کے جویا تعلیم کے حوائج سلیقہ کے آرزو مند ان کو کیا غرض پڑی تھی کہ جب تک پورا مقابلہ نہ کر لیں اور دس پانچ کو ذلیل۔ دو چار کو حقیر ایک آوہ کو جاہل نہ بنادیں شادی پر آمادہ ہو جائیں۔ بی شاہد کا نام شہر میں پوری طرح روشن اور اچھی طرح اچھل چکا تھا۔ اور ابھی تک ایسے بڑے ٹھڈے موجود تھے جو اتنی سی بات پر قہر واپس کر دیں کہ بھائی ہم کوٹ پٹان کی عزت کے قابل نہیں

اب ان کی کھپت ہو سکتی تھی تو اپنے ہی رنگ میں۔ اب چاہے تو یہ سمجھو کہ ایک مچھلی نے سارا جل گندہ کیا چاہے یہ کہ چنے کے ساتھ گھن بھی پسہ۔ شاہدہ کے ساتھ زادہ پر بھی مصیبت آئی کہ اس کا پیغام بھی اڑ گیا۔ میاں کا جواب سن اور زمانہ کی کیفیت دیکھ چاہئے کہ ماں خاموش ہو جاتی۔ یا ان فکروں سے چھٹکارا پاتی جوں جوں دن بڑھے جا رہے تھے۔ اس کا سہم ترقی کر رہا تھا۔ حصن حصین کا ختم یا سمیع کا چلہ دونوں پورے کر لئے۔ مگر بات بڑی کی آئی نہ چھوٹی کی۔ بد نصیب کو ایک آدھ دفعہ نہیں دو چار دفعہ اور فقط اپنوں ہی سے نہیں غیروں تک سے منہ پھوڑ کر کہنا پڑا کہ بچیوں کا خیال رکھنا۔ مگر شاہدہ کچھ ایسی بدنام ہو چکی تھی کہ کوئی حامی ہی نہ بھرتا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ رحیم شاہدہ کی داروغہ حساب کتاب کی مختار سالن گرم کرنے آگ کی بھری انگلی لے آ رہی تھی گرمی کا موسم تھا۔ چوکھٹ پر چڑھتی تھی۔ کہ پاؤں رپٹا اور دھڑام سے گرمی۔ سفید چادر مالال غالیچے، ریشمی پردے سب بھرتے ہوئے۔ کہنیوں تک دونوں ہاتھ منہ ٹھوڑی کھٹے سب کی چربی نکل آئی رچینا بڑھیا تو نہ تھی۔ مگر پچاس کا بیٹا ضرور تھا۔ خاصی شریف خاندان کی عورت اور ایک اوسط درجہ کے شوہر کی بیوی تھی۔ مگر پے در پے موتیں اور متواتر مصیبتیں کچھ ایسی آکر پڑیں کہ پانگ پر درمی تک نہ رہی۔ ایک کڑیل بیٹا مرا۔ ایک جوان بیٹی گئی۔ مازندہ تھی وہ پھونس۔ بھائی موجود تھا وہ دیوانہ چار ساڑھے چار برس سے یہاں کام کر رہی تھی۔ کل کا دن یا سکھ کی رات تو ایک گزرا نہ گزری ہر وقت کل کل اور پٹ پٹ تھی۔ اُلوگدھی بات بات میں چور بے ایمان۔ مگر پٹ بری بلا ہے۔ اُٹھاتی جو پڑتی اور بھگتی جو آتی۔ شاہدہ کے دربار میں اتنا بڑا واقعہ اتنا سنگین جرم اتنا عظیم تصور مصیبت تھی آفت تھی۔ قیامت تھی۔ بڑھیا جو ایک آدھ دفعہ پٹ بھی جھکتی تھی آج موت کا یقین کر بیٹھی۔ آگ تو خیر دوسری اماؤں نے آکر بجھائی مگر شاہدہ کو صبر کہاں اُنھی جو منہ میں آیا کہا اور سنایا۔ مگر یہ کافی نہ تھا۔ ایک لات ایسی ماری، پھر انگلی پر

جا کر گری اور بھیسے ہوئے چہرے سے خون نکلنے لگا۔ اس وقت تو بات گئی گزری ہوئی۔ مگر رات کو اپنے گھر پہنچی تو ہلنا دو بھر تھا۔ بی شاہدہ کو جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ کھانا دیوانے بھائی کو کھلاتی ہے۔ تو یہ اہتمام کیا تھا کہ ہمیں سے کھاپی خالی ہاتھ جائے۔ یہاں سے جا کر دیوانے بھائی کا کھانا پکاتی۔ آج گئی تو بدن چور تھا۔ اور آگ میں جل رہی تھی۔ مگر اسی حال میں گرتی پڑتی اٹھی آٹا گوندھا۔ روٹی پکائی کھلا چکی تولیہی مگر نیند کہاں ساری رات یہ معلوم ہوا کہ انگاروں پر لوٹ رہی جو صبح حکیم کے ہاں گئی نسخہ لکھوایا۔ پیسہ پاس نہ تھا۔ تین مہینے کی تنخواہ شاہدہ پر چڑھی ہوئی تھی۔ سوچا کہ تنخواہ لے آؤں اور علاج شروع کروں۔

۔۔۔۔۔ یہاں آئی تو بھینسا بھی مشکل تھا۔ بڑی مشکل سے ڈولی میں بیٹھ جائے ہائے کرتی آئی۔ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ شاہدہ صورت دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی۔ اور چوتڑے سے نیچے اتر کر کہنے لگی،
 ”فینسوفی کس بات کی ہے تو کس کے حکم سے آج غیر حاضر ہوئی؟“
 رحیمؑ۔ ”آپ میری حالت دیکھئے میں کام کے قابل ہوں؟“
 شاہدہ۔ ”حالت میں کیا ہے۔ اگر کام کے قابل تو نہیں ہے۔ تو اپنا عیوض دیا ہوتا۔“

رحیمؑ۔ ”میں بیگم کس کو لاؤں؟“
 شاہدہ۔ ”آہستہ بات کر۔ گستاخ بدتمیز۔“
 رحیمؑ۔ ”میری تنخواہ دیدے تھے تو دووائی ٹھنڈائی کروں؟“
 شاہدہ۔ ”تنخواہ ضرور ضرور دیا اور کچھ ہر تنخواہ نہیں مل سکتی۔ کام کرو اس کے بعد تنخواہ مانگو۔“

رحیمؑ۔ ”بیم میں تو مر رہی ہوں کام کیا خاک کروں گی؟“

شاہدہ۔ ”پھر گستاخی کا بات۔ اُلو کا موافق بات مت کرو۔ بھل جاؤ۔“
 رحیمہ۔ ”بیگم میری تنخواہ دے دو میں چلی جاؤں۔“
 شاہدہ۔ ”بکومت پہلے عوض حاضر کرو۔ اس کے بعد تنخواہ کا درخواست
 کرو۔ جتنا نقصان ہوا وہ سب کاٹا جائیگا۔“

رحیمہ۔ ”آپ ایک کڑی نہ دیجئے۔ میں عوض کہاں سے لاؤں گی؟“
 شاہدہ۔ ”تمہارا بھتیجی موجود ہے۔ اس کو بھیج دو کام کرے گا۔ تم ہرگز نہیں
 جانیکا جب تک وہ نہ آئے گا۔“

رحیمہ۔ ”بیوی میں تو بڑھیا تھی۔ برقع سر پر ڈال لیا۔ سیانی بچہ کو کیسے باہر
 نکال دوں مجھ پر تو پڑی تھی نوکری کر لی۔ اس کو کیا عرض جو وہ نکلے۔“

شاہدہ۔ ”وہ نہیں نکلے کیوں نہیں؟“
 رحیمہ۔ ”بیوی عزت بھی آخر کوئی چیز ہے یا نہیں۔ آخر میں تو اسے بچھاؤ
 کیسے باہر نکال دیں۔“

شاہدہ۔ ”تم عزت دار ہے اُلو اچھا تم کو عزت دے گا۔ تم مت لاؤ اُسکو“
 رحیمہ۔ ”بیوی ذرا تو زبان سنبھال کر بولو۔ میری جان بھل رہی ہے۔ آپ تنخواہ
 دیجی میں دیں نہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔“

شاہدہ۔ ”چپ رہو اُلو تم نہیں جاسکتا۔ ہم ابھی تمہارا علاج کرتا ہے۔“
 رحیمہ برفصیب کو تنخواہ کا ملنا تو درکنار خالی جانا بھی امرت ہو گیا۔ ارادہ کیا
 تو شاہدہ نے زبردستی پکڑ کر بٹھالیا اور حکم دیا کہ بلا اجازت یہاں سے سر کی تو سخت
 سزا ملے گی۔ ادھر اس کو بٹھایا ادھر آدمی بھیج بھتیجی کو بلا بھیجا کہ رحیمہ بلا رہی ہے منیر
 آئی تو اس کی صورت دیکھتے ہی رحیمہ بیتاب ہو گئی اور کہنے لگی ”تو کیوں آئی۔“

منیر۔ ”تم ہی نے تو بلایا ہے۔ آدمی گیا تھا۔“

رحیمؔ۔ ”بڑی بیگم آپ ہی بندہ فیصلہ کیجئے۔ بھلا کسی کی کواری بچی کو اس طرح بلا لینا اچھی بات ہے۔ ہم غریب سہی۔ فقیر سہی۔ مگر اپنی عزت تو رکھتے ہیں۔ ہاتھ بیچا ہے ذات تھوڑی بچی ہے۔ دیکھئے تو سہی۔ منیر کو بلا لیا!

شاہدہؔ: ”گدسے کی بچی۔ عزت دار کی جو روچ رہو۔ ہم تنخواہ دیں گے۔ سفت کام نہیں لیں گے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم مرتا ہے تو اپنا عیوض دو۔ تمہاری موت ہم کو تکلیف نہیں دے سکتی“

یہاں تک بھی مصالحت نہ تھا۔ اس کے بعد شاہدہ کا غصہ اور تیز ہوا اس نے فوراً رحیمؔ کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ تجارت میں ہل ہلا رہی تھی۔ چوٹ میں مر رہی تھی۔ مگر اپنی بیماری اور موت دونوں بھول گئی۔ چلنے لگی تو بھتیجی کا ہاتھ پکڑا مگر نیچے سے ایک اس زور کا دوہتر پڑا کہ آنکھیں کھل گئیں :

”گدسے کی بچی یہ نہیں جاسکتی۔ جب تک دوسرے آدمی کا انتظام نہ ہو جائے“
رحیمؔ۔ بیگم ذرا انصاف تو کیجئے میں کس طرح سیانی بچی کو آنکھ سے اوجھل کر دوں“

شاہدہؔ: ”تہیں نکل جاؤ۔ ابھی نکلو۔ ہم دوسرے آدمی کا انتظام کرتے ہیں جس وقت آگیا اسی وقت اس کو نکال باہر کریں گے۔ چلو باہر جاؤ نکلو نکلو ابھی چلو چلو فوراً غارت ہو بڑھو آگے بڑھو“ :

رحیمؔ روتی ہوئی باہر نکلی۔ اس خیال سے کہ شاید باپ کچھ تصفیہ کرے۔ اس کے پاس مردانہ میں پہنچی۔ مگر وہ بھلا ماش بھی تو شاہدہ ہی کا باپ تھا۔ ساری کھٹا سن چکا تو کہنے لگا: ”مس صاحب کے انتظام میں ہم کو دخل کی ضرورت نہیں“ :

مایدوس ہو کر پھر گھر میں آئی تو شاہدہ نے دوسری عورت کو بلا کر کہہ دیا تھا منیرؔ کو اپنے ساتھ لیجاؤ اور جب تک ہم حکم دیں اپنے پاس رکھو۔ حکم کی تعمیل میں کیا دیر

ہوسکتی تھی۔ منیر حمیدہ کے ساتھ روتی ہوئی جا چکی تھی۔ چاروں طرف دیکھا ہر ایک سے پوچھا۔ کتنی سنتی پھری، روتی گڑ گڑاتی پھری مگر کس کی مجال تھی کہ شاہدہ کے معاملہ میں دم مار سکتا۔ یہ گرمی کا پہاڑ سادہ۔ کیسی دوائی اور کس کی ٹھنڈائی پانی کے دو گھونٹ بھی نصیب نہ ہو سکے۔ زاہدہ اور ماں دونوں شاہدہ کا ظلم دیکھ بھی رہے تھے۔ اور رچیا کی بے گناہی پر کلیجہ بھی کٹ رہا تھا۔ مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ شاہدہ سے تو کیا رچیا سے بھی بات کر لیتے۔ شام کے وقت زاہدہ اور ماں عصر کی نماز سے فائز ہوئے تو شاہدہ نہاد ہو کر کلب کے واسطے کپڑے بدل باہر آئی۔ اتنے میں منین کا بلا تھا۔ رچیا کو حکم دیکر کہا۔

”تم مکار لوگ اتنا نہیں خیال کرتے کہ کسی کو تکلیف دینے کا تم کو حق کیا ہے تم بیمار ہے تو اچھا بات ہے اتنے روز منیر کو کام کرنا چاہیے۔ اگر اس سے پہلے ہم کو آدمی مل گیا تو ہم اسکو چھوڑ دے گا“

رچیا ”بھلا بیوی ذرا انصاف سے بات کرو جو ان بچی کیسے ایسے چھوڑ دوں خدا کے واسطے بتاؤ تو ہسی وہ ہے کہاں؟“

شاہدہ چلی گئی۔ تو رچیا نے حسرت سے اس کی ماں کی طرف دیکھا۔ جب وہ بھی خاموش رہی تو باہر آئی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی کہ شاہدہ واپس آئی اور حکم دیا ”اس بڑھیا کو ابھی نکال دو۔“

نکلی۔ چلی۔ گھر پہنچی بخار تیز تھا۔ جسم بھنا جارا تھا لیٹی مگر نہ لیٹا گیا۔ اٹھی کھڑی ہوئی کلیجہ میں پھر ہوک اٹھی اور اسی طرح تڑپتی تڑپاتی آئی۔ شاہدہ آرام کرسی پر لیٹی تھی۔ کہ رچیا نے گڑ گڑا کر کہا:-

”بیگم خدا کے واسطے غصہ کو تھوک دو اور مجھ پر رحم کرو۔ میں نے اتنے دن آپ ست کی ہے آخر کچھ تو میرا بھی حق ہے مجھ پر اگر کوئی مصیبت آتی تو آپ ہی کے

پاس پہنچتی۔ آپ خیال تو کیجئے کہ آخر جو ان بیٹی کو کوئی بھی آنکھ سے اوچھل کرتا ہو بیگم کواری لڑکیوں کی آبد تو موتی کی سی آب ہے آپ دیکھ رہی ہیں کہ کیا وقت جا رہا ہے۔ دوپہر سے بجی مجھ سے چھوٹی ہوئی ہے۔ میں تو بیگم اپنا بخار بھی بھول گئی دشت اپنے اما باؤ کا صدقہ بہن بھائیوں کا صدقہ۔ بھپر رحم کیجئے اور بتا دیجئے کہ میری بچی کہاں ہے۔ اگر کہیں اور بھیج دیا ہے تو میں گرتی پڑتی رہیں پہنچوں گی۔ اور اس کو لاؤں گی۔“

مشاہدہ۔ ”میں ماما کی طرح سیدھی اور زاہدہ کی طرح بیوقوف نہیں ہوں۔ کہ اس لغاطی میں آجاؤں۔ میں نے جوابات تھی وہ کہدی“
رحیمہ۔ ”بس تو بیوی میں تھانہ میں جانی ہوں۔“
اتنا سنتے ہی مشاہدہ آپے سے باہر ہو گئی۔ بلا اٹھا کر تڑا لیسے مارے کہ بڑیا بلک گئی۔ اور روتی ہوئی بھاگی۔

مشاہدہ نے اتنی ہوشیاری اور کی تھی کہ چلتے وقت منیر اکے ہاتھ میں ایک سونے کا چھلا ڈال دیا تھا۔ بچی تیرہ برس کی جان کبھی بھولے سے بھی رات کو بھولی سے جدا نہ ہوئی۔ ذرا چراغ جل جاتے تھے تو غریب کو ایک ایک لمحہ ایک سال ہو جاتا تھا اب جو اس دھوکے میں پڑحمیدہ کے ہاں پہنچی تو اس کا لڑکا شہرانی کبابی، جواری ڈھنڈاری، نشہ میں دھکت، نالافتی میں مست، منیر اکو دیکھ لگا بھکی بھکی باتیں کرنے۔ بچاری کو سنا نا اگیا؟۔ کچھ دیر تو چپکی بیٹھی رہی اور پھر سیدھی اٹھا دروازہ کھول اگھر سے باہر آ، جدھر منہ اٹھا ہوئی۔ رات کا وقت عورت ذات، بازار سے ناواقف، محلہ سے بے خبر، چاروں طرف ڈھونڈ مستی پھری خاک پتہ نہ چلا۔ کہیں آدھی رات کے قریب پوچھتی پوچھتی گھر پہنچی تو پھر بھی بد نصیب دروازہ کھولے بیہوش پڑی تھی۔ اگر ہشیار کیا۔ بڑی مشکل سے آنکھ کھلی تو

اُٹھی۔ بھتیجی کو کلیجہ سے لگایا اور اتنا روئی کہ پھر غش آگیا۔ رچیا کی حالت لمحہ بہ لمحہ ردی ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے کہیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں ہوش آیا۔ تو پانی مانگا اور کہا :

”خدا کے واسطے منیر! میرے منہ اور ہاتھ میں لکڑیاں جل رہی ہیں ان پر پانی ڈال دے۔ بلا سے ذرا تو ٹھنڈک پڑے۔“

منیر! نے پانی ڈالا تو ذرا جان میں جان آئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ دیوانہ ایک دن اور ایک رات کا بھوکا اول جلول بک رہا تھا کہ دروازہ پر دو سپاہی اور ایک دفعدار آ موجود ہوئے اور دروازہ اندر گھسے چلے آئے

”منیر! تیرا نام ہے۔ یہ چھلا تو خیر نکل آیا، بٹن کہاں ہیں؟“

منیر! ”چھلا کیسا۔؟“

دفعدار ”چوری اور سرزوری! مال موجود چور موجود۔ اس کے باوجود تو پوچھتی ہے بٹن کیسے؟ مس صاحب کے بٹن اور چھلا تم دونوں لیکر بھاگیں۔ بٹن سیدھے ہاتھ سے اِدھر دے“

منیر! ”اجی ہم تو چور نہیں ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھ ہیں مس صاحب نے زبردستی پہنا دیا تھا۔“

دفعدار ”ہاں ٹھیک ہے۔ چل ہمارے ساتھ۔ آ تو بھی کھری ہوئی اِدھر چل۔“

آگے آگے بیمار اور پیچھے پیچھے مردہ رچیا۔ اس کے ساتھ معصوم اور سیدھی سیران کے پیچھے سپاہی اور دفعدار سب مل ملا کر تھانے پہنچے۔ تھوڑی انہمی ہو۔ ہوا دونوں پھوپھی بھتیجیاں حالات کر دی گئیں :

اس واقعہ کی تیسری رات تھی۔ دو بج رہے تھے۔ احاطہ حالات کے

ہر سست خموشی چھائی ہوئی تھی۔ پیل کے سبز پتے اور گلابی مال کو پلین ان دونوں بیگناہوں پر حسرت کے آنسو گرا رہی تھیں۔ دفعتاً رجیٹ کی طبیعت زیادہ بگڑی اُس نے منیرؔ کو اپنے پاس بلا کر کلیجہ سے لگایا اور کہا ”میرا اب آخر وقت ہے۔ زندگی کی اُمید نہیں میرے بعد خدا کے سوا تیرا کوئی وارث نہیں۔ مقدمہ کا نتیجہ جو کچھ ہوگا۔ تقدیر کا لکھا ہے مٹنے والا نہیں۔ خدا مس صاحب کا بھلا کرے۔ آہ میری محنت کا بدلہ میری خدمت کا سلوک یہ ہی تھا۔ خیر خدا ان کو خوش رکھے۔ میں نے ان کا نمک کھایا ہے۔ بددعا نہ دوں گی اب میری آواز نہیں نکلتی۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں تھوڑا سا پانی اگر لمبا لے تو نپکا دے“

پھوپھی کی گفتگو سنتے ہی منیرؔ بیتاب ہو گئی۔ اس کے قدموں میں گڑبڑ اور کہنے لگی :

”اس حالات میں۔ میں بے گناہ گرفتار ہوں۔ پھوپھی جان خدا کا واسطہ یہاں میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ میں نہ معلوم کیسی تقدیر لے کر آئی تھی۔ کہ میری وجہ سے آپ پر بھی مصیبت آگئی۔ پانی کہاں سے لاؤں؟ گھڑا خالی پڑا ہے؟“

رجیٹا۔ ”اے بچی بدن بھلا سا جارہا ہے خدا کا واسطہ پانی۔“

منیرؔ۔ ”اے بھائی پہرے والے تھوڑا سا پانی دیدو۔ میری پھوپھی کی حالت بہت خراب ہے۔“

پہرے والا۔ ”تجھ کو یہاں چھوڑ کر دو کوس پر پانی بھر نہ جاؤں کہ تو بھاگ جائے؟“

رات مریض پرتڑپتے تڑپتے اور بکتے بکتے صبح ہوئی۔

کو تو ال صاحب آئے ملازموں کو دیکھا اور رجیٹا سے پوچھا تو اس نے

”ہم دونوں پھوپھی بھتیجیاں چور ہیں۔ یا نہیں۔ خدا ہی اسکا فیصلہ کرے گا۔
 ہاں تقدیر میں جو رسوائی ہوئی تھی وہ ہو گئی۔ یہ میری جوان بچی گھر چھوڑ قید میں آگئی
 ہم اپنے گھر میں رہتے تھے جو روکھی سوکھی خدا دیتا تھا کھاتے تھے یہ خبر نہ تھی کہ
 قسمت یہ دن بھی دکھائے گی۔ اپنی تکلیف کا خیال نہیں۔ ہاں یہ رنج ہے کہ ہماری
 آبرو برباد ہوئی۔ ہم برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اب اس بچی کو کون
 قبولیگا۔ جو ہم پر پڑی خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ یہ بچی نہ لینے میں نہ دینے میں۔ اس وقت
 بیگناہ گرفتار ہوئی ہے۔ ہمارا قصور صرف اتنا ہے۔ کہ ہم غریب ہیں۔ مفلس ہیں۔
 میں بیمار ہوں مر رہی ہوں۔ ہم پر رحم کیجئے۔ خدا آپ پر رحم کرے گا“
 رچیا کی گفتگو سچی تھی۔ کو تو ال آدمی معقول تھا۔ بات سنتے ہی تھک کو پہنچ گیا
 اور اسی روز دونوں کو رٹا کر دوا دیا۔

آٹھواں باب

”زاہدہ“ ماں جان نانی صاحبہ کے کچھ اور حالات بیان کیجئے۔ مجھے تو
 ان کی باتوں میں بہت ہی لطف آتا ہے۔ ہم بد نصیب ہیں کہ ہم کو ان کی زیارت
 تک نصیب نہ ہوئی۔“

ماں۔ ”ارے بیٹی کیا سناؤں وہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ وہ صورتیں
 خاک میں چھپ گئیں۔ مرنیوالیوں کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اب وہ صورتیں
 کہاں؟ اب تو نئے نئے لوگ نئی نئی باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ اگلی باتیں دیکھنے
 میں آتی ہیں نہ سنتے میں جدہر دیکھو سنئے دور اور جس طرف آنکھ اٹھاؤ انکھ رگ
 وہ بیٹیاں ہیں نہ مائیں وہ گھر والیاں ہیں نہ بیویاں۔ میرے تو دیکھ دیکھ کے اوسان
 اڑتے جاتے ہیں۔ دور کیوں جاؤں اور کو کیا کہوں۔ اپنا ہی گھر دیکھوں۔ اپنے ہی

پیٹ پر نظر ڈالوں۔ رچما کے ساتھ جو ہوئی ہے۔ میرے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خبر نہیں سچا ری پر کیا گزری۔ میں تو اس کی صورت کو ترس گئی۔ بھلا وہ بچی معصوم آس نہ پاس غریب پیٹ میں آگئی؟

”راہدہ“ ماں اماں۔ یہ تو سچ کہتی ہو۔ میں بھی تھر تھرا کا نپ رہی تھی جب وہ روتی آئی ہے اور گھر کیاں پڑی ہیں۔“

”ماں“ کوئی آج اسی گھر میں نئے نوکار دامائیں تو آئے ہی نہیں۔ اللہ نے اپنی اپنی حیثیت کے موافق سب ہی کو دے دیں۔ اماں جان کے ماں بھی کہ بچاری غریب آدمی ہیں ایک نوئی پھوٹی اب تک پڑی ہوئی ہے۔ مگر بڑی پھوپھی کے ہاں نقش بنی ایسی آئی کہ مرکز ہی نکلی۔ جوانی اور بڑھاپا سب کے سامنے اسی دہلیز پر کاٹ دیا۔ ڈیڑھ برس کی راند ہوئی مگر اس آن کی عورت تھی۔ کہ اس کا پلہ تک کسی کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ نانی جان کے ماں کا حال تو کیا سناؤں اللہ کا شکر ہے ان کے ہاں ایک چھوڑ نین تین ماما میں گھر میں اور دو نوکر ایک بار درچی باہر تھے مگر وہ تو نوکروں اور ماماؤں پر کیا موقوف ہے محلے اور پڑوس تک کو عزیزوں سے زیادہ سمجھتی تھیں۔ آج کے زمانہ میں اگر وہ ہوتیں تو یا تو یہ دنیا ان کو بیوقوف سمجھتی یا وہ اس دنیا کو دیوانہ۔ تم کو بھی شاید تعجب ہو گا۔ بھنگن سے بوا اور بھشتی سے بھائی کر کے بات کرتی تھیں۔ ماما نے کسی رشتہ کی عورت کا بچہ لیکر پال لیا۔ اودھ مر گیا۔ بچہ برس دو برس کا نہیں پانچ چار مہینہ کا نہیں فقط لچھ دن کی جان۔ گرمی کا یہ حال کہ چیل انڈا چھوڑے دونوں ماما نہیں آئی۔ تیسرے دن آئی تو اس سے یہ تک نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کے دانت۔ اس پر غضب یہ کہ آپ چو لھے کے آگے بیٹھی روٹی ڈال رہی ہیں اور دم نکل رہا ہے اس نے آکر رونا شروع کیا تو آپ بھی روٹی چھوڑ چھاڑا اسکے ساتھ رونے لگیں رشتہ کی ایک خالہ وحیدی وحیدی تھیں یہ تو خبر نہیں کہ کیا رشتہ تھا

اور کس کی بیٹی بیوی تھیں مگر اتنا سنا تھا کہ ان کے ساتھ کی کھیلی ہوتی ہیں۔ ہم بیٹھے کنوئیں میں۔ وہ چھوٹی بارہ ورسی چار آنڈولی کا فاصلہ کبھی جانا بھی ہوتا تھا تو چلتے چلتے آندھ آجاتی تھی۔ مگر ان خالہ وحیدہ کی وضع داری یہ تھی کہ آندھ ہی جلتے مینہ جائے مگر ان کا جمعہ کا پھیرانا غہ نہ ہو۔ ساٹھ برس سے اوپر عمر تھی۔ مگر حال یہ تھا کہ جب تک رہیں بارہ مہینے کٹری آتھیں، برفع سر پہ چلی آ رہی ہیں۔ نانی جان ہزاروں روپے کی آدمی تھیں منکے کے منکے اشرفیوں کے بھرے پڑے تھے مگر جمعہ ولے دن دوپہر ہی سے ان کی راہ دیکھنے بیٹھ جاتی تھیں۔ خالہ وحیدہ کی آن یہ کہ ایک آنہ کا پانوں کا مٹھا ہمیشہ ہاتھ میں لیکر گئیں اور نانی جان کا شوق یہ کہ صورت دیکھتے ہی لپکیں۔ اور دروازہ میں جا کر پان لئے پھر کسی گھل گھل اور مل مل کر گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں کہ دیکھ کر بھی تعجب ہوتا تھا۔ مزایہ تھا کہ جب تک وہ بیٹھی رہتی تھیں۔ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہو جائیں۔ ہمارا بچپن تھا ہم کو ان کی صورت دیکھ دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ ماموں جان نے ایک دفعہ اتنا کہہ دیا تھا کہ خالہ سے پیچھے باتیں کر لینا پہلے میرے کپڑے نکلوا دو۔ اس پر اتنی بگڑیں کہ تین دن تک وہی کپڑے پہنے اور چوباسے پھرے۔ مگر انہوں نے کپڑے نہ دے۔ جب چوتھے دن قصور معاف کر دیا اور عہد کیا کہ آئندہ نہ کہوں گا تو راضی ہوئیں۔ رشتہ نہیں نانا نہیں کنبہ نہیں۔ برادری نہیں۔ مگر چھوٹے سے بڑے تک سب کا منہ خالہ خالہ کہتے خشک ہرنا تھا۔ ایک ان کے ساتھ کیا۔ ہم نے تو سب کے ساتھ ان کو اسی طرح ملتے دیکھا اور بات کرتے سنا۔

سیمٹا گھر کی نوڈی تھی۔ اس کی لڑکی پانچ برس کی مری۔ رات بھر مروے کو کلیجہ سے لگائے بیٹھی رہیں۔ اس کا میاں اتنا نالائق تھا کہ شادی ہوتے ہی طوطے کی طرح ویدے بدل گیا۔ کبھی برسوں چھٹے مہینے ایک آدمہ دن کو بھیجتا، مگر جب وہ بیمار

بچہ کو لئے ڈولی سے روتی اتری اور اُس کے میاں نے اکر کہا ”بیگم صاحب دیکھئے تو سہی یہ نظیرا کو کیا ہو گیا۔“ تو اپنے ماتم سے بچھونا بچھا لڑکی کو لٹا دیا۔ خود دواپس کے دونوں وقت پلائی تھیں“

میری آنکھیں جو سس دیکھ چکی ہیں وہ اب نظر نہیں آ سکتا۔ دل ان صورتوں کو نگاہیں ان چہروں کو اور کان ان باتوں کو تڑپ رہے ہیں۔ ترس رہے ہیں اور ہنرک رہے ہیں۔ میرے اموں جان کی شادی ہے۔ دگیں انگنائی میں رکھی ہیں اور آپ مونڈ سے پریشانی کھانا تقسیم کر رہی ہیں ء

مجید ایک بن بابا پ کا بچہ نو دس برس کا ہو گا۔ پچاس روپے کی لیمپ کی جوڑی ماتم میں لئے آیا اس کی بھی خطا نہ تھی اور نانا جان کو بھی معلوم نہ تھا۔ انہوں نے اصل میں جوڑی بھیجی نوکر کے ماتم، اس بیوقوف نے پہلے تو دو چار آوازیں ماماؤں کو دیں مگر شاہی کا گھر۔ کچھریاں پک رہی تھیں۔ سنتا کون تھا۔ لڑکا اتفاق سے پہنچ گیا۔ اس کے ماتم میں دیدی۔ بچہ نام کا تو لڑکا تھا۔ مگر پھر بچہ ہی تھا۔ خوشی خوشی لے آیا۔ چوتھے پرچہ رہا تھا کہ پاؤں رپٹا اور دونوں چین سے گر میوں ٹکڑے ہو گئے۔ نانی جان دنگ تھیں۔ مگر نانا جان کا عصہ بہت تیز تھا۔ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور دلدار کو پکڑ کر مروانہ میں لے گئے۔ خدا جانے اوہ مو کرتے یا کھال اوہیڑتے اللہ نانی جان کو بخشے۔ مہانوں کو چھوڑ پڑو کروا مروانہ میں پہنچیں اور کہنے لگیں ء

”صوبہ دار صاحب۔ اس بد نصیب بچہ نے اپنی بیوقوفی سے دونوں لیمپ جن میں تیل پڑنا تک نصیب نہ ہوا ضرور توڑے مگر جبوقت تم اس کا ماتم پکڑ کر چلے ہو اس وقت اس کی نظریں جن میں بیگناہی کا غدر تھا تمہارے چہرے پر تھیں۔ میں اس وقت اس کے دل کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کی زبان غاموش تھی اس کی آواز نکلتی نہ تھی ادا اسکی حالت اس وقت اس گائے کی سی تھی جو قصائی کے قبضہ میں تیز چھری کو

دیکھ کر ہسم رہی ہو۔ میں جانتی ہوں یہ معصوم ہمارے پیٹ کی اولاد نہیں۔ مگر اس کی قیم صورت، اس کی خاموش آنکھیں، چپ تھیں اور اب بھی ہمارے رحم کی خواستگار ہیں یہ ایک مظلوم انسان اور ایک بگناہ ہستی ہے جو اس وقت ہمارے قبضہ میں ہمارے بس میں ہے۔ ہم کو اختیار ہے کہ ہم اس کو ماریں پیشیں۔ سزا دیں۔ چھوڑیں اس کے سر پر باپ کا سایہ ہے نہ ماں کی شفقت، اس کی تکلیف سے، اس کی مصیبت سے باپ کا دل، ماں کی ماتا متاثر ہونے والی موجود نہیں مگر آج وہ دن ہے جو ہزاروں ارمائوں۔ سینکڑوں فتوں سے ہم کو میسر آیا اس خدا کے برحق نے ہم کو یہ خوشی عطا فرمائی جس کی مخلوق اس وقت ہمارے رحم کی منتظر ہے اور جو خود ہماری حالت کا مطالعہ کر رہا ہے صوبہ دار صاحب اس کے قبضہ میں کچھ نہیں یہ روکر چپ، ہسلا کر خاموش اور پٹ کر ساکت ہو جاوے گا۔ مگر اس کی آنکھ کا ہر آنسو، اس کی آہ کا ہر حصہ بہت وزنی ہوگا۔ یہ بے بس کی فریاد اور بیکس کی شکایت ہوگی۔ اس سرکار میں اور اس دربار میں جواز لی وابدی ہے

صوبہ دار صاحب بہت نازک وقت ہے۔ اس بچے کو کلیجے سے لگا لیجئے اور اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھیے وہ آسانی بادشاہت کا راج کر نیوالا تخت حکومت پر نظر آئیگا۔ اس سے التجا کیجئے اور ہم سے آمین کہلوائیے کہ اپنے حبیب کے طفیل اپنے رسول کا تصدق اس طرح ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور ہم پر رحم کرے۔ ہم سب کو ٹھے پر کھڑے یہ باتیں سن رہے تھے۔ مانا جان بننے لگے تو اس کو خود نانی جان نے گلے سے لگایا اور ساتھ لے کر آئیں۔ پاس بٹھایا اور کھانا کھلنے لگیں۔ کچھ رات زیادہ آگئی تھی وہیں پڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ رات کا ایک بج ہو گا کہ کھانا مکال کر دو کھانے بیٹھیں بچہ کو جگایا پہلے اس کو کھانا کھلایا۔

کیا وقت تھا۔ بچہ کھانا کھا رہا تھا اور وہ اپنے ماتہ سے اسکو پانی دے رہی

تھیں ؟

کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی تھیں کبھی اسکو جھکارتی تھیں ؟

جب بچہ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ اس کے بعد انگنائی میں آئیں۔ یہ خبر نہیں کیا۔
مگر گڑ گڑا کر دعا مانگی اور پھر آکر خود کھانا کھانے بیٹھیں۔

نوائے باب

جس طرح زائدہ کی شادی کا اختیار ازبندارتا تھا ساجدہ کو تھا۔ اسی طرح
شادہ کی شادی کے متعلق اس کی مجال نہ تھی کہ وہ دم مار سکے۔ رقعہ آیا۔ دیکھ بھال
بات چیت کچھ نہ ہوئی۔ صرف ایک شام کو اتنا معلوم ہوا کہ کل شادہ کا نکاح ہے
ماں نے اتنا تو کہا، کیا کہہ رہے ہو۔ مائیوں بھی نہ بٹھاؤ گے۔ مگر جب یہ سنا کہ تم
ان باتوں میں دخل نہ دو اور ایسی لغو رسم کا ذکر اب میرے سامنے نہ کرنا تو خاموش
ہو گئی ؟

دوسرے دن سہ پہر کو مہمان آنے شروع ہوئے مگر کون ؟ ماں کا ملنے والا۔
ایک نہیں۔ باہر باپ کے ملنے والے اور اندر لڑکی کے !

ایسی حالت میں غریب دخل ہی کیا دے سکتی تھی اور اس کی رائے کو پوچھتے
کون تھا اور اگر ہماری رائے غلط نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اسکا بڑا حصہ خود
دلہن کے مشورے اور سہیلیوں کی صلاح ہے۔

المختصر شادہ منسرحن بن اور میکے سے وداع ہو سسرال جا پہنچیں ؟

ایم۔ ڈبلیو حسن ڈاکٹر تو نہ تھے۔ مگر ڈاکٹری کی تعلیم کے واسطے دو دفعہ ولایت گئے
اور دونوں دفعہ جیسے گئے ویسے آگئے خوشحال باپ کا بیٹا تھا۔ روپے کی کمی نہ تھی۔
مگر سوا اس کے کہ نام مسلمانوں کا تھا۔ شروع سے آخر تک اور گھر سے باہر تک کوئی

چیز اسلام کی نہ تھی۔ لباس خوراک۔ رہنا۔ پہنا کھانا۔ پینا۔ ملنا۔ جلنا۔ بولنا۔ چالنا۔
 غرض ہر فعل اور ہر قول مسلمانوں سے سینکڑوں کوس دور تھا۔ اور اسی پر بس نہ تھی۔
 غضب یہ تھا کہ روزہ دار جاہل اور نمازی بیوقوف سمجھے جاتے تھے۔ قیاس یہیں
 تک ختم ہو جاتا تو خیر اگلے زمانہ کے سید سے سادے مسلمانوں کا نوہ مضحکہ اڑتا تھا۔
 کہ خدا کی پناہ۔ بُرائیاں اُن میں ہوتی تھیں۔ بیوقوف وہ بنتے تھے، بربادی قوم کا
 سبب وہ، جہالت کا باعث وہ، افلاس کی وجہ وہ، غرض کوئی عیب کوئی خرابی کوئی
 نقص اور کوئی بُرائی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ ہو۔ یہ رنگ ہیں پچیس برس سے مشرحن
 کے خاندان پر چھایا ہوا تھا **الْحَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثَاتِ** خدائی فیصلہ ہے۔ گاڑے
 میں گاڑے اور زربفت میں زربفت کا پیوند ٹھیک ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے
 خیالات کی وہ میزان پچی کہ سبحان اللہ۔ آٹھ نو سو روپے ماہوار کا کر ایہ جاہل کا تھا
 دو سالم کا دل علیحدہ تھے۔ روپیہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ بچے صرف دو جن اور حسینہ
 اور دو میاں بیوی، چار دم جن میں اب ایک اور بڑھ گیا۔ پانچ آدمیوں میں ڈیڑھ ہزار
 کے قریب آمدنی نہایت بے فکری اور اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔ چار ماہ میں دو چھوکیاں
 ایک ہزار اند خانہ سال۔ باہر سائیس اردلی۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔
 اماؤں کا یہ حال تھا کہ چھوکر ہی بھی دواڑہ پر آتی تو کہتی کہ "سائیس سے بولو گاڑی کھینچے"
 اب شاہدہ کی روزانہ زندگی یہ تھی۔

آٹھ بچے کے قریب سو کر اٹھتی۔ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے چائے کی پیالی اور دو
 انڈے کچھ توں کھاتی اس کے بعد غسل خانہ جاتی۔ نہاد ہو کر باہر آتی۔ بال بنواتی
 کپڑے پہنتی اور ڈاک دیکھتی۔ کھانا کھاتی۔ اخبار پڑھتی۔ سو جاتی۔ اُٹھ بیٹھتی۔ منہ ہاتھ
 دھوئی۔ کنگھی کرتی۔ کلب جاتی آتی۔ اخبار پڑھتی۔ کتاب دیکھتی باتیں کرتی سو جاتی۔
 دو ڈھائی سال تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ تاکہ نام سے تو اُس کو

ہمیشہ نفرت رہی اور ماں کے ساتھ ہی زادہ دشمن تو نہیں۔ مگر کچھ ایسی دوست بھی نہ تھی۔ ماں سو عقل مندوں کا عقل مند اور ماناؤں کا دانا و باپ تھا جس نے بیٹی کو اپنا دیوانہ بنا دیا۔ ہفتہ میں ایک دو مرتبہ اس سے ملنے کو البتہ آجاتی اور دنیا دکھاوے کی شرم یا پیٹ میں رکھنے کا لحاظ جو کچھ بھی تھا۔ کھڑے کھڑے ماں کو بھی صورت دکھا جاتی ورنہ وہ میکے کے نام سے متنفر اور صورت سے بیزار تھی۔ حدیہ جو کہ دو برس شادی کو ہو گئے۔ دکھ سکھ بھلی بری صحت علالت سب ہی طرح سے گزری مگر اس نے ایک دن کیا ایک لمحہ کے واسطے مایا بہن کا آنا اپنے گھر پر گوارا نہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک چھوڑو دوزخ خانے ہو گئے۔ پہلا بچہ خاصا آٹھ روز زندہ رہا۔ پیدا بھی ہوا مر ابھی۔ مگر جننے میں یا مرنے میں ماں نہ آسکی۔ گھر بیٹھے بیٹھے ماستکی ماری ہر چند جلی اندر نہ پائی۔ مگر ماں جانے کی اجازت نہ ملی۔ اس لئے کہ معقول پڑے کئے شریف ہشیار سمجھ دار آدمیوں میں جاہل پھوٹر وحشی نالائق آدمی کے جانے سے سوائے بدنامی کے کیا حاصل۔ دوسرا بچہ نرس کے طفیل نانی کے ماں آجاتا اور دونوں دیکھ لیتیں مگر دور سے کیونکہ ایسا نہ ہو کسی کی بری عادت بچہ پر اثر ڈال دے یہ بچہ جس روز سے پیدا ہوا اس روز سے ایک نرس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ تعلیم جدید نے جہاں دنیا کے نسواں سے بہت سے تقاضے دور کئے ہیں وہاں دودھ بھی ماؤں کے سینے سے خشک کر دیا ہے کہ بھیڑ بکری کا فیوہ ہے۔ پھر بھلا شاہد کے واسطے اس کے زیادہ کسر نشان کیا ہوتی کہ وہ کلب میں میویوں کے سامنے بچہ کو گود میں لئے چھاتی سے لگائے بیٹھی ہیں۔ اور بچہ چہر چہر کر رہا ہے۔ بچہ ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا کہ اتنا حقیر ہو گئی۔ گو وہ قوم کی ایسی ہی کو لھن چاری تھی۔ مگر گھر والوں کے یہ خنے دیکھ سمجھ گئی کہ بھار مشکل ہے۔ اس سے پہلے کلٹر صاحب کے بچہ کو دودھ پلا چکی تھی۔

ایک ہفتہ کا نوٹس دے نچیک ساتویں دن سب کے سامنے بچہ کو چھوڑ سیدی

ہولی۔ بہتیر احسن اور شاہدہ منت خوشاد کرتے رہے مگر اس نے

آخر شاہدہ اپنی اگلی طبیعت پر آئی اور کہنے لگی

”ہم تم کو پولس میں بھیج دے گا۔ ہمارا بچہ بھوکا مرے گا“

انما۔ ایسی ایسی پولس میں بھیجنے والیاں بیسیوں دیکھ لیں ہم نے اسی واسطے

نوش دیا تھا اور تم سے پہلے پولس میں رپورٹ اور میم صاحب سے ذکر کر دیا ہے۔

اب آگے نقلی میم صاحب کیا بول سکتی تھیں وہم ہی تو ہو گئیں اور انا اپنا بستر

سنبھال سیدھی ہولی

اتنا کہ جاتے ہی میاں بیوی، ساس نند، سب ہی کے چھلکے چھوٹ گئے سوچا

یہ تھا کہ جا کہاں سکتی ہے کتنی ہے بکے دو۔ یہ خبر نہ تھی کہ اتنا سچ بچ کی میم صاحب ہے

چاروں طرف تلا تو پ ڈالی، نوکر چھوڑے، ماماں گئیں، ہر سمت تلاش کیا ایک ایک

سے کہا۔ لیکن اتنا بازار کی مٹھائی تو تھی نہیں کہ مول آ جاتی۔ بارہ گھنٹہ کا دن صاف

آنکھوں میں کٹ گیا اور چھ مہینہ کا بچہ بھوکا پیاسا دودھ کو بلکتا اور اتنا کوزہ ستر ہا۔

تعلیم یافتہ گروہ میں سے تو کوئی کام نہ آیا ان کو ضرورت نہیں کہ مدد کریں نہ کسی کو حق کہ

”کلیف دے۔ ماں ماں نے جب سے یہ خبر سنی۔ مچھلی کی طرح تڑپ گئی۔ جب شام

ہلک کچھ انتظام نہ ہوا تو زاہدہ سے کہنے لگی ”بیٹی لائیں اماں کے ماں ہواؤں۔ وہاں شاید

کوئی اتنا مل جائے“ زاہدہ نے اس رائے سے اتفاق کیا تو ماں کو کیفیت جا کر سنائی۔

انہوں نے کہا ”بیٹی انا کاشا تو ایسی بڑی بات نہیں بستی ہی موجود ہے، ڈیڑھ برس کا بچہ

گو دین دودھ پنی رہا ہے۔ غیر بھی نہیں دور پرے کی رستہ دار ہے مگر شاہدہ کا نام ایسا

بیکل گیا ہے کہ سب کانوں پر اتھو دھرتے ہیں۔ بستی ہے تو غریب اور مصیبت ماری

نگوڑی! ایسی راند ہوئی ہے کہ صورت دیکھ کر جی کڑھتا ہے۔ خاصی کھاتی مٹی ایک میاں

کے مرنے سے دودھ دانوں کو محتاج ہو گئی۔ نوکری تو دیکھا کرے گی۔ کبکھت کبھی گھر

ن میں سے کہنے سے دو چار دن کے لئے چلی جائے گی۔ جب تک انا کا
ایسا غضب نہ ہو کہ بی شاہدہ اپنے میم پنے میں کوئی ایسی دیسی بات کہہ
جی ذرا بستی کو تو بلا لا۔

دونوں ماں بیٹیوں نے بستی کو ملکر رضا مند کیا پہلے تو بستی انکار کرتی رہی جب
اصرار حد سے بڑھ گیا تو کہنے لگی: "خالد جان اچھی بات ہے مگر میں ٹوکر ی تو کرتی
نہیں اپنا بچہ سمجھ کر دو چار دن کو مہمان کے طور پر چلی جاتی ہوں۔"

بستی کو رضا مند کر اسی وقت ڈوڈلی منگو پرچہ لکھ ماں نے شاہدہ کے پاس
بھیجا دیا۔ اور مسٹر شاہدہ حسن کے صاحبزادے مسٹر حسن بستی کا دودھ پینے لگے۔

اپنے مطلب کے دیوانے بھی سیانے ہوئے ہیں پھر شاہدہ تو ماشاء اللہ ستو
سُرتوں کی سُرتی تھیں۔ اپنی غرض باؤلی، اپنا مطلب اندھا، جی کھول کر خاطر کی۔
زبان بھی مینھی، باتیں بھی اچھی۔ دوسری انا کا انتظام چار دن کیا پندرہ دن بھی نہ ہوا۔
تو بستی کو کہنا پڑا۔

"بیوی اب مجھے رخصت کیجئے۔ میں تو صرف چار دن کو کہہ کے آئی تھی۔"
یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ رعونیت اور فرعونیت اگر طینت ہے تو ہر وقت ہو۔
یہ کیا اپنے وقت پر تو منو بلائی بن گئے۔ اور جب اپنی غرض مکمل گئی تو ماش کے آٹے
کی طرح اکڑ رہے ہیں۔ بستی بچاری سیدھی سادی مصیبت زدہ سات پانچ
اور وہ ہکا فریب جانے کیا اور سمجھے کیا۔ شاہدہ نے اس کی سادگی سے فائدہ اٹھایا
اور ایسا شیشہ میں آتارا اور وہ راگ دیا۔ کہ ماں کوئی پڑھی اور کہہ دیا کہ۔

"اچھی بات ہے آپ انا کا انتظام نہ کیجئے میں دودھ بلا دوں گی۔"
باتوں میں تفسیر اور خوشامدوں میں کمی تو دوسرے ہی روز سے شروع ہو گئی تھی
مہینہ جس روز تو رنگ ہی اور تھا بستی دیکھ دیکھ کر تعجب اور حیران ہوئی جاتی تھی۔ کہ باتو

جناب جناب کہہ کر منہ خشک ہوتا تھا یا جناب سے تم، تم سے بستی، اور بستی سے اتنا بن گئی۔ مگر زبان دے چکی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ یہ زبان وہ چیز ہے جس سے بیٹا بیٹی پر اے ہو جاتے ہیں۔

اول اول تو آٹھویں دسویں جب جی گھبرا یا اور جی جا ہا گھنٹہ دو گھنٹے کو گھرائی۔ مگر پھر نو شاہدہ نے وہ رعب بٹھایا کہ ضرورت بھی ہوتی تھی تو اجازت لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی +

وقت کی بات ہے کہ جاڑے ختم ہوئے اور گرمی شروع۔ ابھی رات کی سردی خاصی باقی تھی کہ بخار چمکے اور بخار کے ساتھ کھسر اس غضب کی کہ تھامے اچھے کھیلنے ملتے بچے تین تین چار چار دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ غضب یہ تھا کہ بچوں ہی پر بس نہیں ساٹھ ساٹھ پینٹ پینٹ برس کے بڈھے بڑھیاں اس میں چل بسے۔ بستی کا لڑکا شریف دو برس کا تھا اور طرہ یہ پھوٹی آنکھ کا دیدہ اسر بدسل کا سرا بستی کی تو زندگی کا سہارا اور دنیا کی تمام امیدیں جو کچھ تھیں وہ یہ بچہ۔ اسی کے اوپر رنڈا پا کاٹ رہی تھی اور اسی امید بھیتی تھی کہ بڑا ہو کر سب مصیبتوں کی تلافی

اور رنجوں کا معاوضہ کر دے گا۔ بچہ کپکپاتا اگر مایا کی گود میں پڑ گیا۔ ماتھا تو اس کا

وقت ٹھنکا تھا مگر ایک آدھ گھنٹہ بعد تو جسم کی یہ حالت کہ چنے بھوں لوح

پر نشانی کیسی۔ امٹا کی ماری کی جان نکل گئی۔ چاروں طرف بچہ کو گود پر

پھری۔ کبھی اس سے کبھی اس سے دیوانوں کی طرح ایک ایک سے

دکھاتی، ایک ایک سے صلاح لیتی۔ اس کے دل کی تو یہ حال

بڑی۔ بستی کے پاس آئی اور کہا۔

”اتنا اس کو کھسرا نکلے گا اور یہ سب گھر میں پھیلے گا“

اور اپنی ماما کے پاس بھیج دے

بستی۔ ”واہ بیوی واہ کیا کہہ رہی ہو! کس دل سے بھیجیوں اس کو تو وہاں بھیجیوں اور میں یہاں پڑی رہوں ایسا مجھے کیا لاپسج واہ!“

شاہدہ۔ ”ایسا ہونا چاہیئے۔ اور ہوگا۔ تمہارے بچہ کی وجہ سے ہم اپنا گھر بیمار نہیں کر سکتے“

بستی۔ ”بیوی تو میں کب کہتی ہوں کہ تم اپنا گھر بیمار کرو۔ تمہارا گھر تم کو مبارک ہو میں اپنے بچہ کو لے کر چلی جاتی ہوں۔ ذرا ڈولی منگوالوں“

شاہدہ۔ ”تمہارا بچہ کا جینا نہایت ضروری جس کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ باپ اس کا نہیں۔ تم خود مفلس فقیر اور ہمارا بچہ بھوکا رہے تو تمہاری بلا سے“

بستی۔ ”تو پھر جو آپ کہے وہ کروں“

شاہدہ۔ ”تم یہاں سے ہرگز نہیں جا سکتیں“

بستی۔ اور میرا بچہ؟

شاہدہ۔ ”اس کو جانا پڑے گا۔“

بستی۔ ”واہ بیوی واہ کیا بات کہہ رہی ہو!“

شاہدہ۔ ”سچ کہہ رہی ہوں۔“

بھی یہ فقرہ ختم نہ ہوا تھا کہ منتر حسن اندر آئے اور بیوی نے کہا،

ن اتنا کہ بچہ کو بخار ہے اور چیچک معلوم ہوتی ہے اس کا یہاں رہنا

- کو فوراً مانی اماں کے ہاں بھیج دیجئے کہ وہ اس کی مانی کو دیدیں“

”واہ بیواہ میں خود لے کر جاؤں گی“

- تو ہرگز نہیں جا سکتی۔ ہمارا بچہ بھوکا روئے گا“

سے گا تو میں کیا کروں“

”ست کر“

اب شاہد آگے بڑھی۔ بچہ کو زبردستی گود سے چھین آدمی کو دیا کہ فوراً لیجائے
 بستی بچہ کے ساتھ جانے کے واسطے چلی۔ مگر آدمی نے اس کو اندر کر دیا اور
 شاہد نے کہا ”تو اگر گئی تو عمر بھر جلجلا نہ میں مٹے گی ہمارا بچہ کوئی وجہ نہیں کہ
 بھوکا رہے“ چونکہ ایسے بیمار بچہ کو شاہد نے ماتھ لگایا تھا۔ جس کو چپک کاہنیش
 تھا پورا عمل کیا اور باہر آکر جب دیکھا کہ مانتا کی ماری چاروں طرف ٹکراتی پھرتی ہو
 تو نہایت غصہ سے کہا۔ ”اس فضول جھگڑے سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں دوسروں کو
 پریشان کیا۔ لے پہلے نہا اور پھر بچہ کو دودھ پلا“

اپنے سامنے نہلا دودھ پلوا بچہ نرس کو دیا اور خاص طور پر باہر کے آدمیوں کو
 تاکید کر دی کہ اتنا نہ نکلنے پائے دو یا تین مرتبہ غریب نے جانے کی کوشش کی مگر
 ناکام رہی۔ مجبور سر پر کوڑکھٹک گئی۔

بستی کا بچہ شریف جب نانی کے پاس پہنچا تو شاہد اور شریف کے دونوں ناناں
 ششدر رہ گئیں۔ سبب پوچھا تو نوکر کچھ بتا نہ سکا۔ حیران تھیں کہ بیمار بچہ کو نوکر کا
 دے جانا اور بستی کا نہ آنا آخر معنی کیا رکھتا ہے۔ بچہ کا یہ حال تھا کہ بخار خوب زور کا تھا
 مگر دو برس کے بچہ کی بساط ہی کیا۔ آنکھ کھلتی تھی تو اماں اماں کہہ کر پکارتا تھا معصوم
 کی اس حالت پر شاہد کی نانی کا دل بگڑ گیا۔ ڈولی منگو اسیدھی تو اسی کے ماں
 پہنچیں۔

پہلا روز پہلا اتفاق بلکہ شادی کے بعد نانی تو اسیوں کا پہلا آتنا سامنا
 تھا۔ بستی تو ان کی صورت دیکھتے ہی دوڑ کر روتی ہوئی لپٹ گئی اور پوچھا۔
 ”خالہ جان میرا بچہ کیسا ہے؟“

”دیکھئے تو سہی میرے شریف کو نکال دیا کہ وہ بیمار ہے اور مجھے نہیں جانے
 دیتیں! ہر پرے بٹھا دے کہ میں نہ نکلوں“

نانی۔ ”بہی چل تو میرے ساتھ چل بیمار بچہ تڑپ رہا ہے۔ کوکر نہیں چاکر
نہیں۔ اس ظلم پر کمر باندھی۔“

شہادہ۔ ”تو کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ میرا بچہ بھوکا مر جائے؟“
نانی۔ ”مرضی اللہ کی اگر مر جائے تو مگر اپنا بچہ کیوں چھوڑے۔ تم کو دس ہزار
دفعہ عرض تھی اس کو رکھا ہوتا۔ اب یہ اکیلی کیوں رہے۔ چل بستی کھڑی ہو۔“

غریب کے اوپر سب شیر ہوتے ہیں۔ نانی کے سامنے اس لئے نہیں کہ وہ ذاتی تھیں
بلکہ اس لئے کہ بگڑا ہوا انسان بھیرا ہوا شیر ہو جاتا ہے۔ شہادہ اور احسن دونوں چپکے
کھڑے دیکھتے رہے اور وہ بستی کو ساتھ لے، دولی میں بٹھا، سیدھی ہوئیں۔

قدرت کے کارخانے بھی عجیب ہیں۔ بستی جس وقت چلی ہے تو اس کی آنکھ سے زارو
قطار آنسو کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔ رستے بھر دعائیں مانگ رہی تھی اور کہتی تھی۔
”اے الہی اپنے حبیب کا طفیل میرا بچہ تندرست ہو جائے۔“

بلبلاتی ہوئی اتنی بچی کو گود میں لیا۔ کلیجہ سے چٹایا۔ تو بخار ہلکا تھا۔ صبح تک
بخار کا پتہ بھی نہ رہا اور بچہ خاصی اچھی طرح ٹھہرنے لگا۔

ادھر یہ گدڑی، ادھر جو بندہ یا بندہ، اتنا کا انتظام ہو گیا اس کے دودھ کی آرائش
ڈاکٹر نے کی۔ چپک کا دور تھا احتیاطاً اٹا کو نہ لایا دھلایا سننے کپڑے پہنائے۔ بچہ کو دودھ
دیا مگر نہ معلوم دودھ میں کیا زہر تھا کہ خلق سے اترنے ہی بچہ بخار میں لوٹا، ڈاکٹر آئے،
ایڈی ڈاکٹر آئی۔ الغرض دودھ دور است یہ تانتا بندھا رہا تیسرے دن دیکھا تو بچہ چپک
کا جال لپا ہوا ہے۔ اب البتہ دیکھنا تھا کہ کون کون احتیاط کرتا ہے اور امتا کے سامنے
بھی بات قائم رہتی ہے یا نہیں، لیکن انسوس وہ نشو و نماں دوسروں ہی تک تھی۔ اپنا
بچہ بڑا تو احسن اور شہادہ دونوں احتیاط و معیرہ سب بھول گئے۔ چپک دانے بچہ کو دونوں
کے دو کوہ پست پست کر رونے اور چپٹ چپٹ کر پیا کرتے۔ گرمی کا موسم۔ بخار اس

غضب کا کہ ماتھ نہ دھرا جائے۔ ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں نے ہر چند نسخے بدلے اور دوائیاں تبدیل کیں۔ مگر بخار نے جنبش نہ کی۔ شاہدہ اب بچہ کو خود اپنے ساتھ لے کر سوتی تھی۔ اور سوتی کیا خاک تھی رات بھر روتی تھی سینکڑوں اور ہزاروں مرتبہ اس توقع پر ماتھ پھیرتی تھی کہ پسینہ آ رہا ہوگا۔ مگر بدن تو تانبا تھا کہ دھکنے کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ موسم کی گرمی بخار کی حرارت۔ چھپکاپ کا اثر موصوم دماغ کہاں تک صحیح رہتا۔ سسٹم ہو گیا۔ یہ بھی عجیب وقت تھا۔ بچہ گردن دے دے ٹپکتا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور آوازیں شکل تمام نکل سکتی تھی۔ اس وقت ما کا یہ فعل بھی کچھ کم قابل بیان نہ تھا۔ کہ بچہ کی یہ کیفیت دیکھ کر اس نے نرس سے کہدیا کہ ”تم اپنے پاس رکھو مجھے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے“ نرس کی مانتا نہیں رشتہ نہیں مانا نہیں۔ سسٹم میں گرفتار موصوم اکیلا پڑا، سرد مہنتا اور کوئی اگر جھانکتا تک نہیں۔ نرس اکثر بیٹھی رہتی مگر بعض دفعہ ضرورتاً اور کبھی کبھی خواہ مخواہ اکیلا پڑا چھوڑ کر چلی جاتی۔ یہ حالت چار روز اور چار رات رہی مگر گھر کے کسی آدمی کو اگر جھانکنا تک قسم تھا۔ نرس تھی۔ یا بچہ۔ چوتھی رات بچہ کی حالت اول شام سے ہی خراب ہو گئی تھی۔ آج آدھی رات کے وقت بچہ نے آنکھ کھولی مگر افسوس وہ آخری موقع تھا ان ہی آنکھوں سے جو میٹھ چکی تھیں چاروں طرف دیکھا اور ایک ننھی سی سبکی کے ساتھ ہمیشہ کو بند ہو گئیں ۛ

بچہ کے مرتے ہی شاہدہ وحسن کا پہلا کام یہ تھا کہ مردے سے دور بھاگ گئے غسل و دفن نوکروں نے کیا۔ مگر ماں شاہدہ اس صدمہ سے جو فطرتی تھا محفوظ نہ رہ سکی۔ اس نے کو شش مش میں کمی نہ کی۔ لیکن جس قدر بھلاتی تھی اُس قدر بچہ کی صورت زیادہ یاد آتی تھی ۛ

ماں شاہدہ کے حالات سے بے خبر نہ تھی۔ ارادہ کرتی تھی کہ خود جائے اور

سمجھائے۔ مگر ہمت نہ بڑھتی تھی۔ زیادہ تر اس وجہ سے بھی کہ وہ جانتی تھی

سمجھانے مگر آؤں گی رنجیدہ۔ لیکن مانتا تھی اس حالت سُن سُن کر کلیجہ کٹتا تھا۔ آخر اس نے یہ خط بیٹی کو لکھا:-

بیٹی شاہدہ سلیم کو ماں کی طرف سے بہت بہت دعا۔

بچہ کی موت کا جو اثر تم پر ہوا وہ صحیح اور جو حالت تمہاری ہوئی وہ درست، تم اس صدمہ میں جو کہو وہ بجا اور جو کہو وہ جائز۔ مگر یہ جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، قدرت کے ادنیٰ کر شے اور دنیا کے معمولی کھیل ہیں۔ معاملہ خالق اور مخلوق، حاکم اور محکوم کا اور مفت بلہ زبردست اور کمزور، شیر اور بکری کا ہے۔ قطرے کا اکڑنا دریا کے سامنے۔ پرکا پھیلنا پہاڑ کے روبرو۔ طاقت اور لغویت کے مواکیا ہو سکتا ہے۔ قدرت کا فیصلہ، خالق کا انتظام، عالم کا نظام بے معنی نہیں کچھ وقعت اور حقیقت رکھتا ہے۔ مجبور کے معاملہ میں اختیار کمزور کے سامنے طاقت انہل کے روبرو دولت، اگر دماغ صحیح اور رائے صائب ہو تو اس زبردست ہستی کا پتہ دیں گے جس کی سلطنت اور حکومت ابدی اور ازلی ہے۔ یہ امتیاز یہ برتری اگر خیال درست اور قیاس معقول ہے تو پتہ دیں گے اور دکھادیں گے کہ عزت میں ذلت اور دولت میں نکتہ پوشیدہ اور پنہاں ہیں کمزور ہستیاں مظلوم صورتیں اور معصوم انسان۔ اگر نظر وسیع اور آنکھ گہری ہو تو ہانکے پکارے علی الاعلان اور آبادار بلند فنا کے نعرے اور انقلاب کے نغمے لگا اور گار ہے ہیں۔ چین کا ہر پھول، پھول کی ہر ٹکڑی، بہار کا موسم۔ موسم کا ہر ذرہ، خوشی کی گھڑی، گھڑی کا ہر لمحہ، خزاں اور کے دو ذرہ، لپہ بادی رنج اور مصیبت کا پیام ہے۔ کاٹ رہی ہو جو بچکیں۔ اور

لے رہی ہو جو دے دیا۔ غریبوں کی آہ، یتیموں کا نالہ، بیوہ کی فریاد
 خالی جانے والی نہیں۔ ان مظالم کی انتہا اور ان زیادتیوں کی حد ہے
 کیا تم کو وہ وقت یاد نہیں جب تمہارے ماتحتوں ایک بڑھیا اما۔
 ایک معصوم بچی رچھا اور منیراً دونوں چھوٹی بھتیجیاں حالات میں سنبھلی
 اور رات کے بارہ گھنٹے اس کواری لڑکی نے جو تمہارے گھر پر تمہاری
 دلہیز پرانولی میں بیٹھ کر آئی، اور برقع اوڑھ کر اُتری، سپاہیوں کی
 گالیوں اور ظالموں کی جھڑکیوں میں گزار دے! تمہارے دونوں لشکار
 ظالموں کے پنجہ میں تھے رات ان کے سر پر تھی اور بیکیوں کا وارث کوئی
 نہ تھا! وہ تمہاری نگاہ میں تمہاری رائے میں مجبور بے بس جو کچھ بھی
 ہوں، مگر ان کے سر پر ایک وارث تھا، ایک مالک تھا، ایک حاکم
 تھا، وہ جس کی عزت تم سے زیادہ، جس کی طاقت تم سے بڑی، اور
 جس کی حکومت تم سے وسیع۔

میں اس خیال سے اس وقت بھی کانپی اور اب بھی کانپ رہی
 ہوں کہ بستی کا بچہ پھلر و سالال، کلیجہ کا ٹکڑا، ماں کی گود سے چمٹا
 ہوا، تمہارے جفا کار ماتحتوں نامعقول حکموں اور خود غرض ترکیبوں
 سے کیسی مصیبت میں پھنسا۔ مابچہ کی صورت کو ترستی رو گئی اور بچہ ماک
 آواز کو بھڑکتا نکال دیا گیا۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تمہارے دل پر تمہاری
 طبیعت پر، تمہارے دماغ پر، اس کا رتی بھر اثر نہ ہوا مگر اس ظلم کا انجام
 اس سختی کا نتیجہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔ خدا کا فیصلہ خاموش اور اس کی
 لائمی بے آواز ہے۔ تم کو آج معلوم ہو گیا ہو گا کہ مانتا کیا ہوتی ہے اور
 بستی کے دل پر کیا گذری ہوگی اور اس کا کلیجہ کس طرح کٹ ہو گا۔ تم کو

خدا نے دکھا دیا اور دنیا نے بتا دیا کہ جس کا کوئی نہیں اس کا بھی کوئی ہو
اور جو بظاہر کچھ نہیں، وہ درحقیقت کچھ ہے۔

دنیا نے تمہاری عقل پر اور زندگی نے تمہاری آنکھ پر نوحہ اور
تمکنت کے پردے ڈال دیے اور تم اس خدا سے جو عزت والا جنت
والا، طاقت والا، قدرت والا ہے ایسی فرسٹ، اتنی بیزار اور اس قدر
متنفر ہو گئیں کہ کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ طاقت رہنے والی
اور یہ دولت مکنے والی ہیں۔ حکومت عارضی اور دولت فانی ہے۔
جوانی جہان اور طاقت چند روزہ۔ صحت کے ساتھ علالت، دولت کے
ساتھ افلاس۔ خوشی کے ساتھ غم، اور آزادی کے ساتھ قید و البستہ ہیں
کبھی سوچو اور غور کرو کہ رحمت پر کیا گدڑی۔ منیرؔ پر کیا بیتی۔ بسنی کیا بیستی اور
تسریف کیا کہتا ہوگا۔ میں کہتی ہوں اور محبت سے کہ یہ وطیرہ غلط یہ راستہ
ٹھیک تھا اور یہ کچن اچھے نہیں۔ شاہ و ڈور اس خدا سے جو حاکم حقیقی ہے
اور لرزانِ روحوں سے جو کمزور و لاچار ہیں۔ بچہ معصوم تھا بھگت گیا۔ جو
بھگتنی تھی۔ یہ جو کچھ ہوا کچھ نہ تھا۔ دنیا کی مصیبتیں، زندگی کی اذیتیں ابھی
بہت ہیں۔ ستمل اور گر سجدے میں اس کے آگے جو بادشاہوں کا بادشاہ
ہے اور لرزہ اس کے حضور میں جو مالکوں کا مالک ہے۔ کنٹرول کو مارا
ظالم عہد کو مسل، نوحہ کو غارت اور خود بینی کو دور کر۔ چل اس رستہ
پر جو سیدھا اور اس ڈگر پر جو صاف ہے۔ وقت باقی ہے اور موقع موجود
گواہِ ابدامت کے آئینوں سے۔ روشِ مندی کی التجاؤں سے۔ جا
اپنے قدموں سے۔ مگر اپنی آنکھوں سے۔ جھک اپنے سر سے جیت
کے آگے۔ منیرؔ کے روبرو اور بسنی کے سامنے،

نشاہدہ! گو میں اٹھا کلیجہ سے لگا یتیم شریف کو جو تیرے علم سے
بچھڑا اور خدا کے علم سے ملا۔

نوائے باب

زادہ کی طرف سے تو باب اس قدر غافل اور اتنا الگ تھلگ تھا کہ کبھی بھول کر
بھی اسکی شادی کا اُسکو خیال نہ آیا۔ ماں البتہ اس رنج میں گھلی جاتی تھی ایک آدم دفعہ
میاں کے منہ پر کہا بھی۔ مگر اس بھلے مانس نے اس کان سننا اور اس کان اُڑا دیا
اور اگر کبھی بہت ہی مہربان ہوا اور بیوی کی پریشانی کو قابلِ لحاظ اور سوال کو لائقِ جواب
سمجھا تو اتنا کہتا کہ: ”مجھ سے صلاح یا مشورہ تو درکنار میرے سامنے ذکر کی بھی ضرورت
نہیں۔ تم جانو تمہارا کام۔ جو میری بیٹی تھی اُسکا میں نے کر دیا اب یہ تمہاری بیٹی ہے
جہاں جی چاہے کرو اور جس طرح دل چاہے انجام دو۔ میں نکاح کے وقت شریک
ضرور ہو جاؤں گا۔ جوڑکے میرے علم میں ہیں یا میں جن کو پسند کرتا ہوں یہ بد نصیب
ان کے قتل نہیں، جو نالائق ہیں وہ ایسے ہی پلٹو بچے ہونگے۔ میں سوچوں تو یہ موقوف
اور غور کروں تو دیوانہ“

بیٹی تو بہر حال بیاہنی تھی میاں کی بے اعتنائی کا نتیجہ یہ تو ہم ہی نہ سکتا تھا کہ ماں زادہ
کو عمر بھر کو ارا بھاسے رکھتی۔ چاروں طرف تلا تو پ مچائی۔ خدا خدا کر کے ایک برجڑا۔ لڑکا
انٹرنس پاس اوسط درجہ کی آمدنی۔ سیدھے سادے لوگ جاہل ٹھوٹ نہ بالکل صاحب
بہادر۔ میاں سے تذکرہ کیا مگر جب وہ تیوری پر بل ڈال کر خاموش رہا اور جواب نہ دیا تو
ہاں کر لی امتیازِ ٹھہر گئی۔ نکاح سے پانچ روز پہلے زادہ ایوں بیٹھی۔ نشاہدہ حقیقی بہن
تھی اور اس کی شریک نہایت ضروری مگر اس لئے نہیں بلکہ دل لگی کرنے اور مضحکہ اُڑانے
باب نے بیٹی کو بلوایا بھیچا چنانچہ پہلے ہی روز کہ لڑکی کو ایوں بیٹھے چند گھنٹے گزرے ہونگے

دونوں باپ بیٹیوں نے اس طرح نکتہ جینی شروع کیا

شہادہ۔ کیوں اماں جان کیا بغیر مایوں کے نکاح جائز نہیں ہے؟

باپ۔ بیٹی تم کو نہیں معلوم یہ تو اسلام کا خاص حکم ہے۔

شہادہ۔ اے ہے اماں جان تو میرا نکاح تو ہوا ہی نہیں؟

باپ۔ ماں بات تو ٹھیک ہے اپنی اماں سے فتویٰ لو؟

آخر خاتمی اور تو بیٹی کی مفارقت کا اثر اس پر شوہر کے کچھ کے، اس پرستم

شہادہ کا مضحکہ اپنی طرف سے ہر چند مالا بہت دیر تک خاموش رہی مگر جب یہ دیکھا کہ دونوں کے دونوں جان ہی کو آگئے تو بیٹی سے تونہ بولی۔ مگر شوہر سے کہا۔

”اس میں شک نہیں کہ خدا نے تم کو اور تمہاری بچی کو ضرورت سے زیادہ عقل اور

حد سے بڑھ کر علم دیا مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ تمہارے سوا دنیا میں جتنے ہیں وہ جاہل

اور بیوقوف۔ اگر اپنی قدیم روایات پر قائم رہنا اور بزرگوں کی تجاویز پر عمل کرنا جہالت

ہے تو مجھ کو اس بیوقوفی پر ناز ہے۔ میں بیوقوف اچھی اور جاہل بہتر لیکن تمہاری عقل

اور علم اس بیوقوفی اور جہالت کے مقابلہ میں شاید تمہارے واسطے مفید ہو تو دوسرے

کے واسطے تو مگر اس مضر اور یقینی ایذا دہ ہے۔ میں آج بیس برس کی بیاہی ہوں بلکہ

زیادہ برابر کی دو لڑکیاں آگے۔ نانی بن چکی۔ جوانی ختم اور بڑھاپا شروع ہے مگر آج تک کسی

بزرگ کے سامنے تم سے ہنسکرات نہ کی۔ تمہاری عقلندی کا نتیجہ اور تعلیم کا انجام یہ ہے

کہ تین برس کی بیاہی لڑکی تم باپ کے سامنے اپنے نکاح کا ذکر نہیں کرنا کھل کھل کر

کر رہی ہے۔ خدا مجھ کو یہ وقت نہ دکھائے۔ کہ اپنے باپ کے سامنے ایسی بے غیرت بڑی

مجھے اس سے انکار نہیں کہ ہمارے ماں اکثر رسیں جو دوسروں سے لی گئیں اور بہت سی

باتیں جو دوسرے دوسرے داخل ہوئیں قابل لغت اور لائق ملامت ہیں لیکن وہ طریقے

اور وہ تدبیریں جو مرنے والے سینکڑوں عمروں کے تجربے اور میوں برس کے عموں کے

کے بعد چھوڑ گئے اُن پر منہ آنا اور بُرا بتانا کھلی ہوئی غلطی ہے۔ بے غیرتی کا تو علاج نہیں منہ اپنا، زبان اپنی، جس کو چاہو برا کہو جس کو چاہو بھلا لگ بات کہو تو محقول اور کام کرو تو درست۔ یہ کیا کہ جو منہ میں آیا وہ کہہ دیا۔ زور پر آئے تو پھول کو تھرا اور سونے کو مٹی بنا دیا مایوں کی رسم جن کا خاکہ اُڑا رہے ہو قدامت کا جو ہر ہے اگر سمجھتے اور غور کرتے تو نتیجہ یہ نہ ہوتا جو شاہد کا ہوا۔

مایوں کی خوبیاں مجھ سے سُنو اور خود ہی فیصلہ کرو کہ یہ جو کچھ میں نے کیا سچا کیا یا بجا۔ قربان جائیے ان پاک رعوں کے جو زندگی کے کیسے کیسے کٹھن رستے اور کیسی کیسی منزلیں اس خوبصورتی سے طے کرنی بتا گئیں :

آج تک یہ تو تم بھی دیکھ رہے ہو کہ اگر شادی کا ذکر بھی آجائے تو شریف بچیاں وہاں سے اٹھ کر دوڑ چلی جاتی ہیں۔ کیوں؟ اسلئے کہ حیا ایمان کا جزو ہے۔ وہ لڑکی جو چار روز بعد شوہر کے پہلو میں بیٹھنے والی ہے کس دل سے چار آدمیوں کے سامنے آنکھ ملا کر بات کرے۔ یا اپنے دل کی کیفیت دکھا کر اور اپنی حالت سننا کہ یہ بتا دے کہ میں تو اس ن کو ترس رہی تھی :

اسلام کا فیصلہ یہ ہے یہ ایمان ہے تو جہان ہے اور شرم ہے تو ایمان ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں شرم و حیا کی دیویاں ہوں کہیں یہ ہماری رسم ضروری ٹھہری یا نہیں؟

ہمارے ماں کا تمدن اس درجہ خراب اور ناقص ہو گیا ہے کہ شادی کے موقع پر چاروں طرف سے خواہ مخواہ کے فتنہ پرداز لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جن باتوں کا سحر نہ پاؤں دل سے جوڑ کھڑا کر دیتے ہیں۔ کوئی بیٹی والوں کو بھڑکانا اور کوئی بیٹے والوں کا بہکنا پلانا فرض سمجھتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ لڑکی ان لغو اور کچر باتوں سے متاثر نہ ہو اور یہ فتنہ پردازیاں اس کے کان تک نہ پہنچیں۔

ایک کواری لڑکی جو پندرہ سولہ برس میکے میں رہی اب اس گھر سے وداع ہوتی ہے اس کی زندگی کا تیار دور شروع ہوتا ہے۔ بلکہ زندگی اب ہی شروع ہوتی ہے کیا وہ یہ حق نہیں رکھتی کہ اس کو اتنی ہمت دیدی جائے کہ وہ تخلیق میں بیٹھ کر اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کچھ غور کرے اور طے کرے کہ اس کو آگے چلا کر کیا کرنا اور کس طرح رہنا ہے؟ مایوں کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ لڑکی کا رنگ روغن خوب نیکے اور اس کو اچھی خوراک دی جائے کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو جو کچھ کھلایا پلایا جائے اس طرح سب کی آنکھ بچا کر؟

یہ میں نے نہایت مختصر طور پر تمہارے سامنے دو تین ہی باتیں بیان کی ہیں۔ مگر جب تم حیا کو عورت کے واسطے فضول سمجھتے ہو تو میں جھوٹی اور تم سچے "میاں، بیوی کی بیوقوفی اور بیٹی مافی جہالت پر مبنیے اور ٹھٹھے لگاتے رہے یا ناخ کے وقت تک اعتراضوں کا سلسلہ برابر جاری رہا مگر مانے مطلق پروانہ کی اور اب زراہدہ بھی سسرال جا نہیںیں +

۱۰ دسواں باب

وداع کے دوسرے روز چالہ تھا۔ شاہدہ اس رسم کو کس طرح جائز سمجھتی۔ اس نے ماں کے سامنے باپ سے کہا۔

"بابا اب تک تو جو کچھ ہوا وہ ہو گیا۔ اماں جان کی ذات سے متعلق تھا اور اس کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی پر پڑا تھا۔ لیکن اب ان کے خیالات ایک دوسری زندگی سے واسطہ رکھتے ہیں یہ وداع کوئی نئی وداع نہیں ہے۔ میں بھی آخر میاں ہی گئی تھی یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ دلہن کو گئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہونے اور طلبی کا تقاضا موجود! کچھ روز ان کو دماں رہنے دیجئے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی عادتیں

خصلت خوبوسے واقف ہوں، اشد ضرورت ہے کہ آپ اس معاملہ میں دخل دیں اور دلہن کو ابھی نہ بلائیں۔“

باب۔ بیٹی آخر سن تو تمہاری اماں بھی رہی ہیں۔ میں ہی اپنے منہ سے منع کر کے کیا لیلوں گا۔ میں نے تو شروع ہی سے اس کے معاملہ میں اسی واسطے دخل نہیں دیا جو ان کی سمجھ میں آیا وہ کیا۔ اب بھی دخل دینا نہیں چاہتا۔ جو ان کا جی چاہے کریں۔
شاہدہ۔ ماما آپ اتنی سی موٹی بات بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ شادی کے بعد میاں بیوی کو ساتھ رہنے کی کتنی ضرورت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کو آج بلا لیں۔“

اما۔ خدا کا شکر ہے کہ میں مسلمان ہوں اور آباؤ اجداد کے وہ طریقے جو موجودہ زمانہ کی کسوٹی پر بھی پورے اُتر رہے ہیں۔ میرے سر آنکھوں پر ہیں۔ مجھ کو میری بچی دو بھر نہیں کہ میں اُس کے شوہر کو اور ساس مندوں کو یہ یقین دلا دوں کہ اس کا کوئی مراجعت والی وارث نہیں۔ لڑکی گھر کا کوڑا تھی کہ نکال باہر کیا۔ وہ درحقیقت کلیجہ کا ٹکڑا ہے اس کی شادی قانون فطرت تھی۔ پورا کر دیا۔ مگر جب تک ماما باپ زندہ ہیں اس کے دکھ سکھ۔ رنج راحت سے غافل اور بے خبر نہیں اور ان کا فرض ہے کہ شوہر کو یہ یقین دلا دیں کہ بیوی قیدی بن کر میرے قبضہ میں اور لونڈی بن کر میرے گھر میں نہیں آئی۔ یہ دلہن جو اس وقت ہمارے گھر کی رونق ہے دوسری آنکھوں کی پتلی اور دوسرے دلوں کا سرور بھی ہے ہم کو یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ شوہر کے تعلقات سسرال والوں کے بڑاؤ اس کے ساتھ کیسے رہے۔ وہ نا تجربہ کار ہے بچہ ہے اگر کسی معاملہ میں وہ صلاح کی محتاج ہو تو اپنے تجربہ سے واقعات سن کر رائے دیں کہ جو کچھ پر گئی وہ کس طرح سلجھے۔ سب بڑی بات یہ ہے کہ ہماری بچیاں اتنی بے غیرت اور ایسی بے شرم نہیں کہ کہہ لو میاں مقنع اور گھر بنگالوں اپنا، دو گھنٹہ کی دلہن اس گھر میں اور ان لوگوں میں جس کو اور جن کو پہلے (یکم) تک نہیں۔ دسترخوان پر بیٹھ کر کابی صفا چٹ کر دے اور حکم دے۔“ اور لاؤ گھر

سے میاں کے سامنے ہڈیاں چھوڑے اور ساس نندوں کے روبرو منہ چیر چیر کر اور بھاڑ بھاڑ کر بوٹیاں چبائے۔ بیچارے کتنے سننے سے ایک آدھ لقمہ کھا سکتی ہیں اسکو شرم کہو، حیا کہو، جدائی کا اثر، فراق کا نتیجہ، جو چاہے سمجھ لو۔ تم ایمان سے کہو کہ جب پالا پڑے ان لوگوں سے جو ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت کو نگاہ میں رکھیں اور سابقہ ہوان لوگوں سے جو کھانے پر، پینے پر، پہننے پر اور صحنے پر غرض ہر کام پر اور ہر بات پر رائے دیں اور خیال ظاہر کریں تو احتیاط ضروری ہو یا نہیں؟ ایمان نہ ملے تو خدا کے واسطے یہ تو تباہ و کہ مغرب جس کا کلمہ پڑھ رہے ہو کیا دلہن کو ساس نندوں کے ماتھ میں چھوڑ دیتا ہے؟ وہاں صرف میاں بیوی ہوتے ہیں۔ یہاں دو لہاکے تمام عزیز دوست بھی اور دشمن بھی!

اس واسطے یہ چالوں کی رسم مقرر کی گئی۔ جس کی بڑی مصلحت یہ بھی ہے۔ کہ دلہن کے ساتھ، دو لہاکے تعلقات بھی سسرال والوں سے بڑھنے شروع ہوں۔ میں نے ساری عمر میں تمہارے میاں کو دو یا تین مرتبہ دیکھا ہے۔ تم بتاؤ کہ اس کو کیا خبر کہ مجھ کو اس کی محبت ہے بھی یا نہیں۔ حالانکہ ضرورت ہے اور اس لئے بیٹی ویکر بیٹا لیتے ہیں کہ ہم اس کو بھی بتا دیں کہ تیری محبت اپنی بچی سے کم نہیں۔ جس طرح نکاح نے ہماری بچی کو مادی اسی طرح ہم کو بیٹا۔ تم ان باتوں کو کیا جانو اور کیا سمجھو؟

گیارہواں باب

زادہ کی خدادی کو سال بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ دونوں بابا بچپن کے فرض سے سبکدوش ہو کر اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ اختلاف فرائض کی وجہ سے نہیں! اختلاف رائے کے سبب کبھی کبھار دونوں میں کچھ کھٹ پٹ سی ہو جاتی تھی۔ وہ اس

نیک بی بی کا ضبط و تحمل اس درجہ بڑھا ہوا تھا۔ کہ وہ جو کچھ بھی کرتا اور جو کچھ بھی کہتا صبر سے دیکھتی اور فکر سے سنتی۔ میاں نے یہ کوشش ہمیشہ کی بلکہ عمر بھر کی کہ بیوی اس کی مرضی پر رہے اور صلاح پر کام کرے۔ مگر خرابی یہ تھی کہ جن باتوں کو وہ عیب سمجھتا تھا یہ ہنر اور جو اس کی نگاہ میں برائیاں تھیں اس کے خیال میں بھلائیاں۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ دونوں کسی خاص معاملہ پر بحث کر رہے ہیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ وہ اپنی کہتا پاتی۔
قابل وہ ہوتا نہ یہ ۛ

جاڑوں کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت انا منہیاری بفل میں ٹوکری لئے آئی۔ گھر والی صورت دیکھتے ہی کہنے لگی ۛ
”آنا ہو سلام۔ کل سے دودھ بلا چکی ہوں دیکھو تو سہی مونٹا سے ماتھ پڑے ہیں۔“

انا بہو۔“ بیوی۔ کیا بتاؤں جب سے آنکھوں میں پانی اترا ہے صاف تو دکھائی دیتا نہیں۔ لاکڑی کے سہارے چلتی ہوں۔ اب تمہاری صورت دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا آؤں۔ ٹھوکر سے دھکا ہے، بڑا پے کے دن ٹیڑھا سودا۔ گریڑوں تو چوٹ لگے سو الگ نقصان ہو وہ مجھدا۔ اس لئے نکلتا ہی چھوڑ دیا۔ تمہاری صاحبزادی کا نوکر دودھ آگیا۔ پرسوں وہاں گئی تھی جا کر بھی پچھتائی۔ ان چوڑیوں سے تو اُن کو نفرت ہی ہے۔ میرے منہ سے نکلا بیٹی تجھے ننگے ہاتھوں دہم بھی نہیں آتا رہے۔ بیوی وہ صاف بگڑ گئی اور کہنے لگی۔ دہم کس چیز کا۔ کیا شوہر کی موت اور زندگی۔ چوڑیوں پر موقوف ہے۔ عبداللہ جیسی چوڑیاں پہنا گیا تھا ایسی ہوں تو ریشیں دے جاؤ۔ نہیں چلی جاؤ۔ خیر میں نے چوڑیاں پہنا دیں ہاتھ اشارہ اند پر اُٹھی وار پانچ نوٹیں جب دو چڑھیں، دو آنہ کی چوڑی دس آنہ گرہ سے دیکر چار آنہ کی بیجیں۔ انہوں نے پہلی ہی چوڑی پر کہہ دیا تھا۔ جو ٹوٹے وہ منہیاری کی۔ ادھر چوڑی چٹ ہوئی ادھر وہ کھلکھلا کر

ہنسیں۔ خیر میں جلتی رہی اور پہنتی۔ جب پس پان چلے گئیں تو نوکری دیکھ کھتی کیا میں یہ کاپنج کی چڑیاں پہننے والیاں بیوقوف ابھی زندہ ہیں" اس پر تو میرے آگ لگ گئی میں نے کہا "بیٹی زبان سنھال کے بولو بیوقوف ہو گئی تم۔ آپ جو ادروں کو بیوقوف بناتی ہو۔ تم سمجھتی ہو ہم عقل مند ہیں۔ پڑ سے لکھے ہیں دو انگلیاں تو ماتھے پر رکھنی نصیب ہوئی نہیں۔ اگلے زمانہ کے لوگ اس کو فرض سمجھتے تھے۔ کہ لڑکی سرگندھو کر اور چڑیاں پہن کر ضرور سلام کرے۔ اب یہ سلام قابل الزام ہیں۔ مگر مجھے ذرا یہ بتا دو کہ پانی کا گلاس لیکر دینے والے سے یہ کیوں کہتی ہو شکریہ۔ پان کسی سے لیکر یہ کس لئے کہتی ہو تسلیم۔ بیٹی یہ وہی فکر یہ تو ہے۔ جو دینے والیوں نے اس طرح لڑکیوں کو بتایا تھا یہ ان ہی کے چبائے ہوئے نوالے الٹ پلٹ رہی ہو۔ تم مجھے ایک کہنیں نہ چار سنتیں"

میں تو یہ کہہ کر چلی آئی۔ مگر اب انشاء اللہ نہ جاؤں گی سلام کرتیں دعا ہی پاتیں مبرا کیا لیا۔ اپنا کچھ کھویا"

منہیاری شریف تھی یا رذیل۔ مگر جو کچھ کہا اس انسانیت اور معقولیت سے کہ باپ جو چپکا بیٹھا سن رہا تھا۔ اس نے بھی شاہدہ کی یہ حرکت پسند نہ کی اور آج عمر بھر میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس اثر کے بندے نے بھی ایک معقول بات سوچی۔ منہیاری چلی گئی تو بیوی سے کہا۔
"انا ہو بات تو تھیک کہہ رہی تھی"

بیوی۔ "تم ہی دیکھو خدا معلوم کس قسم کی بکثت طبیعت لائی ہے کہ کسی سے جھگڑنا ہی نہیں آتا۔ اسی بیٹ کی بچی زاہدہ ہے۔ مگر دونوں کی طبیعت میں حالت میں عادت میں خصلت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس کا بس چلے تو کسی غریب فقیر کو دنیا میں رہنے تک نہ دے

اس کے اختیار میں ہو تو اپنی کھال کی جوتیاں تک حاجت مندوں کو سپنا دے"

میاں۔ میں سال سال بھر سے تو یہ سن رہا ہوں کہ شاہدہ نے اپنے اخراجات اس قدر بڑھا رکھے ہیں کہ آمدنی کافی نہیں ہوتی اور چاروں طرف سے قرض لینا پڑتا ہے۔ اب یہ سنا ہے کہ ہزار روپیہ کا ایک جوڑا تیار ہوا ہے۔ اور کپڑا ہزار سے اس شرط پر لیا گیا ہے کہ اگر تین مہینہ میں روپیہ ادا نہ ہو تو ہزار کے ڈیڑھ ہزار۔ ساس مسرودوں نے بیٹے بہو کو اسی لئے الگ کر دیا ہے۔ بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ جن بھی بیوی کے ان گنوں سے پریشان ہو گیا ہے اور اکثر لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ پہلی تاریخ کو کلب کا سالانہ جلسہ ہے اس کے لئے یہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ زاہدہ سے میں ناخوش ہی ہوں مگر حق یہ ہے کہ اس لحاظ سے تو میں اسے پسند کرتا ہوں کہ وہ آمدنی سے خرچ بڑھنے نہیں دیتی اب تو شاید ترقی پر مدلی ہوئی ہے۔

بیوی۔ ہاں خدا کا شکر ہے۔ پہاڑ پر تنہا رہے ملیں گے۔ آج گئے ہونے ساتواں روز ہوا مگر خط ہے نہ پتہ۔ وہ تو میری طرف سے ایسی غافل ہے نہیں کہہ گئی تھی پہنچتے ہی لکھوں گی۔ خبر نہیں کیا بات ہے۔ خدا خیر رکھے۔ شاہدہ کا کیا کہوں خدا ہی اس کی حالت درست کرے تو کرے۔ میں تو شروع ہی سے کہہ رہی ہوں کہ دیکھئے یہ اونٹ کس کل بیٹھتا ہے تم نے کبھی میری سنی ہی نہیں۔ وہ قرض پر حافظ ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ مر جاؤں اور قرض نہ لوں۔

میاں۔ میں کل گیا تھا تو حسن بھی موجود تھے۔ مگر چپکے چپکے اور رے کے جب وہ چلے گئے تو میں نے باتوں باتوں میں سنا دیا کہ خرچ آمدنی کے اندر رہنا چاہئے۔ مگر وہ کیا ایسی تھی فوراً سمجھ گئی اور کہنے لگی۔ ”ضروری خرچ تو کوئی بھی رک نہیں سکتا۔ منہ سے کہہ دینا آسان ہے۔ آدمی حساب کرے تو معلوم ہو کہ کونسا خرچ فالتو ہے۔ کپڑا نہ پہنے؟ کھانا نہ کھائے۔ آدمی نہ رکھے؟ گاڑی نہ رکھے؟ بیٹی جان کے جو خرچ ہیں وہ اسی کے ساتھ ختم ہونگے مصیبت کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ جب ماتہ

میں نہ ہو تو کہاں سے اُٹھے۔ میں تو ان زندگیوں پر تعجب اور تعجب نہیں افسوس کرتی ہوں بلکہ لعنت بھیجتی ہوں جو عمر مصیبتیں جھیلیں اور پاؤں بلیں، کھائیں نہ پیں اور جوڑ جوڑ کر دوسروں کے واسطے چھوڑ جائیں۔ مجھ سے اگر کوئی یہ توقع رکھے تو یقیناً غلطی ہے۔ اسی وجہ سے مسٹر حسن ناغوش ہیں لیکن ان کی ناغوشی اتنی بے موقعہ اور اس قدر غلط ہے کہ میں اس کی مطلق پروا نہیں کر سکتی اور ایک میں کیا کوئی معقول بیوی بھی نہیں کر سکتی وہ ہوں یا آپ اگر کوئی یہ چاہے کہ ان جاہل بڑی بڑیوں کی طرح جو تھوک لگا لگا کر رو بہ چوڑتی تعین میں بھی کھانا پینا اور ملنا جلنا حرام کر دوں تو حاشا و کلام میں اس زندگی اور اس دنیا سب سے باز آئی۔ انسان دنیا میں مصیبت بھگتے کو پیدا نہیں ہوا دنیا ہمارے واسطے جنت ہے اور یہ جس قدر سامان مسرت ہیں۔ یہ ہمارے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

بد نصیب ہیں وہ کہ بخت جو اس قابل ہیں کہ ان اسباب سے فائدہ اٹھائیں مگر نہیں اٹھاتے۔ خدا ایسے ملعونوں کی صورت نہ دکھائے۔ ان سے سابقہ نہ ڈالے۔ میں نے مسٹر حسن سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اگر اپنے فرض کے ادا کرنے میں غفلت کریں گے تو تیجہ کے ذمہ وار خود ہوں گے۔

یگم میں تو یہ گفتگو سن کر سٹائے میں رہ گیا۔ ایک بات سرسری طور پر کہی تھی اس کے جواب میں پیچھی کی طرح جو زبان چلی شروع ہوئی ہے تو کسی طرح بند ہی نہ ہوئی۔

بیوی غور سے میاں کی باتیں سن رہی تھی اور بیچ بیچ میں ٹھنڈے سانس بھرتی جاتی تھی۔ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ باہر سے ماما نے لاکر خط دیا جس کو دیکھ کر میاں نے کہا۔

”تو زاہدہ کا خط ہے“

بیوی۔ ”بڑھو خدا می جی رکھے۔“

میاں۔ ”تمہارے نام کا ہے تم ہی پڑھو۔“

میاں نے خط کھولا اور اس طرح پڑھنا شروع کیا۔

اماں جان کی خدمت میں بہت بہت آداب -

آپ سے جدا ہو کر یہاں پہنچی۔ کس طرح بتاؤں کہ رستہ کیونکر گنا
اور دل پر کیا گزری۔ آادھر رہی تھی اور دل آپ کے پاس تھا۔ ابھی پہاڑ
ہم سے کوسوں دور تھا کہ سڑک پر سرے سرے تناور درخت جڑے
اُگھڑے دکھائی دے۔ خیال کیا کہ شاید آمد ہی آئی ہو۔ مگر ایک ہودو
ہوں ساری سڑک پر ادھر سے اُدھر تک درخت ہی درخت تھے
جب ہم آبادی کے قریب پہنچے تو اور مصیبت نظر آئی نہ آدم نہ آدمی زاد
مکانوں کا ستھراؤ ہوا پڑا ہے نگاری والے نے کہا کہ صاحب کل شام
کو یہ خبر سنی تھی کہ پہاڑ پر بھونچال آیا اور اس زور کا کہ تمام پہاڑ اٹل گیا
آگے بڑھے تو بیسیوں آدمی مکانوں کے نیچے دبے پڑے تھے عورتیں
مرد بچے بڑے سب ہی تھے کڑیل جوان، بڑے پھونس، کچھ
سک رہے، کچھ ہلک رہے۔ کیا قیامت خیز منظر تھا جو ہم
کو دیکھنا پڑا۔ معصوم بچے ماؤں کے کلیجے سے چھٹے کے چھٹے رہ گئے
پہاڑ کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ کسی کا پاؤں دکھائی دے رہا ہے۔ کسی کی
گردن، کہیں بچہ کی ٹانگ ہے تو کہیں ماں کا سر۔

ایک موقعہ تو ایسا دیکھا کہ بیان نہیں کر سکتی۔ ہزاروں لاکھوں من
کا ایک ٹکڑا ایک عورت کی ٹانگ پر پڑا تھا۔ جڑپ رہی تھی۔ گردن نہ نکلتا
تھا۔ ہم کو دیکھ کر اتھ جڑنے لگی۔ کیا بتاؤں اس وقت دل کی حالت
کیا تھی۔ اب تک وہ تصویر آنکھ کے سامنے ہے ہم چار آدمی تھے مگر چار
کیا ہزار بھی ہوتے تو اس کو سر کا نہ کہتے تھے۔ مجھ کو پاس بلایا اور کہنے لگی

”وہ سامنے مٹی میں میرا صندوق دبا ہے مگر دکھائی دے رہی ہے اس میں دو ہزار روپے کا زبور ہے۔ یہ میری بچی کو دیدینا میں کیسا جواب دیتی۔ کہنے لگی ”پانی پلا دو“۔ ہمارے ساتھ صراحی تھی میں نے پانی پلایا۔ کوئی دو گھنٹے تک ہم وہاں کھڑے رہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے اس کا دم نکل گیا۔ میں نے صندوق نکلوایا کھولا تو واقعی اس میں زبور موجود تھا۔ آگے بڑھے تو ایک محلہ میں البتہ کچھ آدمی زندہ موجود تھے۔ مگر یہ بھی مردوں سے بدتر تھے۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی، کسی کا کولہ اتر، کوئی رو رہا تھا۔ کوئی چیخ رہا، آگے کے محلہ میں آدمی زیادہ بھی تھے اور زخمی بھی اتنے نہیں۔ مگر کچھ ایسا سہم چڑھا تھا کہ بات تک نہ کر سکتے تھے۔ گنتی کے کچھ مکان اور دیکھے مگر وہ بھی اس حال میں کہ حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا مکان رہنے والوں کا اور رہنے والے مرنیوالوں کا کہرا م بجا رہے تھے پہلے ارادہ کیا کہ اٹے ٹوٹ چلیں۔ مگر شام کے قریب سرکاری فوج آگئی ذرا اطمینان ہوا اور ہم ایک مکان میں اتر گئے +

عشاقی نماز پڑھ رہی تھی کہ ایک عورت دیوانہ وار اندرائی اور چاروں طرف دیکھنے لگی اور کہنے لگی ”بیوی اپنے بچوں کا صدقہ میرے دونوں بچے دیدو“ میں متحیر تھی کہ کیا جواب دوں کہ وہ میرے قدموں میں گریزی اور کہا ”میرا جوان شیر اگلے برس مجھ سے بچہ چکا ہے اب مجھ رائد دکھیا ری کے یہ دونو بچوں سڑے ہیں۔ اور میری زندگی ان ہی دونوں سے ہے۔ میری امانت ٹھنڈی کر دو۔ دل ان صورتوں کو ٹپ رہا ہے۔ اسے بی بی میرے بچے ملا دے۔ بچوں والی میرے بچے دکھا دے۔ میرے کلیجے کے ٹکڑے میرے سینے سے چٹا دے۔ میری آنکھوں کے تارے لاپٹی جوانی کا

صدقہ میری چار سال کی کمائی میری ایک برس کی محنت، میں ہاتھ جوڑتی ہوں قدموں پر سر رکھتی ہوں۔ غریب ہوں بے وارثی ہوں۔“
اس کی گفتگو سن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں
تے اس کو بٹھایا کھانا دیا پانی دیا ذرا عقل ٹھکانے ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس
کے دونوں بچے بھی دب کر زمین کے اندر پہنچ گئے ہیں۔

خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا، اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ اس زیور کو کیا
کروں۔ مرد کی وصیت، کیا کا مال، ایک ایک سے پوچھ چکی کہ کون تھی
کیا تھی۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلتا اس سہم کے آگے میں تو سب کچھ بھول گئی
اس کی بچی کو کہہ دو ہونڈوں اور کہاں سے لاؤں کہ اس بار سے بکدوش
ہوں۔ یونہی تمام کام جہنم کے لئے ہیں یہ بیٹھے بٹھائے میرے اعمال کی
اور سزا ملی! آپ مولوی صاحب سے دریافت کیجئے کہ میں زیور کس کو دوں؟
اور اگر کل کلاں کو اس کی بچی کا پتہ چل گیا تو کیا کہوں گی؟۔ فقط اتنا تو
معلوم ہوا ہے کہ مرنے والی کے میاں یہاں جانوروں کے ڈاکٹر تھے اور
اور شاہجہاں پور کے رہنے والے۔ اچھی میری اماں جان کسی کو شاہجہاں پور
بھیج دیجئے۔ شاید کچھ پتہ چلے۔ ثواب کا کام ہے آنے جانے کا کرایہ وہاں
کا خرچ سب میں دوں گی۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ تکلیف گوارا کرے تو
عمر بھر احسان مانوں گی۔

اب یہاں اللہ کا شکر ہے کوئی کھٹکا نہیں سرکار کی طرف سے
سب انتظام ہو گئے ہیں پھر بھی مصیبت ماروں کا کیا حال سناؤں۔
برابریں جو جتنی جی بیٹھتے ہیں ان کی بیوی ماور بہن ہے تین بچے ہیں کل
سات دم۔ مگر ساتوں کے ساتوں زخمی کسی میں اتنا سکت نہیں کہ ہلکے

پانی بھی پی سکے۔ میں دونوں وقت جا کر ان کے ہاں کا سارا کام کر دیتی
ہوں ان کے ہاں سے فارغ ہو کر اپنا کام کر دیتی ہوں اماں جان میرے
کیا ہاتھ پاؤں گھس جاتے ہیں خبر نہیں اللہ کو کونسی اداسند آجائے
اور اسی بہانے مغفرت ہو جائے ؟

میری داماد گنج العرش اور چھوٹی سہال وہیں رہ گئی ہے۔ یہ
بھجواد تہجے۔ ابا جان کی خدمت میں بہت بہت آداب عرض کر دیجو
آپ کی لونڈی

زراہدہ

خط باپ پڑھا تھا اور ماں سن رہی۔ مگر جس طرح دونوں کی طبیعت میں
آسمان زمین کا فرق تھا۔ اسی طرح حالت میں بھی۔ باپ نے ہنس ہنس کر پڑھا اور ما
نے رو رو کر سنا۔ وہ تو خط پڑھ بیوی کے آگے ڈال، روتا چھوڑ، ہنستا چل دیا۔ مگر یہ انھی
وضو کیا دو نفل شکرانہ کے پڑھے کہ خیریت کا خط آیا ایک دفعہ پھر کھولا اور پڑھا اور
سوچنے لگی کہ شاہجہاں پور کس کو بھیجوں اور میرے کہنے سے کوئی جانے کیوں لگا۔ پر آپ
کا رن، بلا وجہ، بلا سبب، کوئی تکلیف اٹھائے تو کیوں اور میں اذیت دوں تو کس لئے؟
چلوں اماں جان سے کہوں شاید وہ کچھ انتظام کر دیں یہ فیصلہ کرنا خط ہاتھ میں لے، ڈوٹی منگوا
میکے پہنچی اور وہاں کچھ تجویز کر کر بیٹی کو یہ خط لکھا :

نور خشی سلما :-

دعا۔ سخت تشویش اور بے حد انتظار کے بعد کل تمہارا خط پہنچا تمہارے
باپ نے پڑھا اور میں نے سنا۔ رنج بھی ہوا اور خوشی بھی صدمہ بھی

اور اطمینان بھی۔ ان ہزار مابندگانِ خدا کی کیفیت پڑھ کر جن پر خدا کا یہ عذاب نازل ہوا بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر جس صداقت کے ساتھ اس مصیبت میں تم مخلوقِ خدا کے کام آرہی ہو اور اپنی راضی اپنا سکھ اور اپنی ضرورتیں دوسروں کے آرام ان کی آسائش اور ان کی خواہشوں پر قربان کر رہی ہو یہ اسلام کا خاص منشا اور مسلمان کا عین شیوہ ہے۔ خوش نصیب ہوں میں ماں جس کے پیٹ سے تم جیسی بچی پیدا ہوئی اور تعریف کے قابل ہے وہ باپ جس کی نسل میں ایسی لڑکی نمودار ہوئی اپنے ذاتی رنج و راحت سے ہر انسان بلکہ انسان کیا جانور تک متاثر ہوتا ہے مگر انسانیت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی تکلیف سے زیادہ اور اپنی خوشی سے بڑھ کر دوسرے کی تکلیف اور دوسرے کی خوشی کو سمجھے۔ مدد دے جو امکان میں ہو اور خدمت کرے جو ہو سکے۔ خدا کے نیک بندے اور خالق کی اچھی مخلوق وہی ہے جو بندوں کا غلام اور مخلوق کا خدمت گزار ہو۔ تم نے اس غضب میں اور اس آفت میں بہت کچھ کیا لے لیا اور پیدا کر لیا۔ کیا ان مظلوموں کی دعا اور ان بیچاروں کی التجا خالی نہ جائیگی جو تمہارے ہاتھ سے دونوں وقت پکی پکانی کھا رہے ہیں۔ ان کی دعا وہ دعا ہے جس کے مقابلہ میں۔ اور ان کی التجا وہ التجا ہے جس کے سامنے امراء کی دولت اور بادشاہوں کی سلطنت بھی وقوت نہیں رکھتی۔ کئے جاؤ۔ جو کر سکتی ہو اور کرتی رہنا جو ہو سکے۔

شاہجہانپور میں نے آدمی بھیجا تھا خدا کے سرخ لگ جائے۔ معاملہ بیڑھا اور امانت پیچیدہ ہو مگر جس خدا کے بھروسہ پر کام شروع کیا ہے وہی ختم کر دے گا۔ دعا گو

تمہاری با

بارہواں باب

شمارہ - میں اگر ایک ایک کر کے جہالت کی بیہودگیوں کو گنواؤں تو شاید تین چار دن میں بھی ختم نہ ہوں لیکن مٹی مٹی باتیں اگر مانتا تم غور سے دیکھو تو صاف معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ اور یہ خیال صریح غلطی اور کھلی ہوئی بیوقوفی ہے۔ کیا نہ کہے آپ کو یہ ہی بتایا کہ مسافر سدا ہا ہا ہے تھکاؤ نہ دو۔

کیا اسلام اسی کا نام ہے کہ ”شام کو دو دنوں وقت ملتے ہرے درخت کے نیچے کھڑی نہ ہو۔“

مگر کھول کر نہ بیٹھو :

”کیا مسلمانوں کا فرض ہے کہ ”پر دیسی کے سامنے جب وہ سفر سے آیا چاول ضرور رکھیں۔“

کیا یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہو سکتا ہے کہ ”پانی کھڑے ہو کر پین تو چالیں دن کا رزق اڑے گا“

اور نا لگیں ہا کر کمانے سے رزق کی برکت ختم ہو جائیگی :

افسوس افسوس کیا آپ اس میں بڑی خوبی دیکھتی ہیں کہ جس عورت کے بچے مر جائیں وہ نہا کر اٹھائے تو لگے : ملے اس کا بچ لگ جائیگا :

اما یونکر یقین آ گیا کہ ”روٹی سے پیاز کھانی منحوس“ :

”چار پائی کی پانچویں او سچی مہینی منحوس۔“

”عورت کے سفید کپڑے منحوس“

کس کس کو وہ ہزاروں - اما آپ کی دنیا تو ان لغویات سے پُر ہے۔ آدمی کیا برا خدا

ہو گیا کہ سب باتیں اسی کے اختیار میں ہو گئیں۔
 ”بچہ کو تہلایا کلا دانہ جلا دو نظر نہ لگ جائے“
 ”مولود شریف ہے اگر لوہا نہ سلگا دو مردوں کی رو صبر آئیں گی۔“
 ”ننگے سر جھاڑو نہ دو۔“
 ”اچھی چھوڑ کر کھانا کھاؤ۔“

اما مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تعلیم جدید نے اب یہ لغویت ہم سے دور کر فی شروع کی ہے۔ اور اس قسم کی چہالت اب آپ کو اپنی ہوا میں بہت کم نظر آئے گی۔ آپ فرار ہی میں کہیں گیلے بال نہ سوؤں۔ یعنی اس وقت کہ شبہ کرانہمی ہوں ابھی نکلی کروں۔ اور وہ بھی اُلٹے سیدھے بال نہیں یا نہ نہیں مگر کسی طرح سمٹ جائیں۔ اما اگر بال کھول کر سونا منخوس ہے اور غالباً منخوس ہی ہوگا جو آپ منع کر رہی ہیں تو ایک بات تو بتائیے یہ بچاری فقیر نیاں تو بڑی بھانوں ہوتی ہوئیں گی جن کو ہر سولہ بھی بال کھولنے کی نوبت نہیں آتی۔

پاپا کی یہ ہمیشہ کوشش رہی میں نے بار بار چاہا کہ آپ ان پرانے دھکوسلوں سے چھٹکارا پا کر ان خیالات پر آجائیں جن کی صداقت آئینہ کی طرح چمک رہی ہے کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ہم معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ہم ان پرانی نیکیجھٹوں سے جن کی قوم محمد یا اڑوس پڑوس کے دو ایک گھروں تک محدود تھی بہت زیادہ قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہم جس طرح اس شہر کے ہر مسلمان کو اپنا سمجھتے ہیں اسی طرح یہاں سے ہزاروں لاکھوں کوس کے رہنے بسنے والے مسلمان کو بھی بہن بھائی خیال کرتے ہیں۔ آپ خود ہی فیما بین کیجئے کہ ہماری کوشش قوم کے واسطے کس قدر مفید ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں ہماری کھب میں ہفتہ چلے ہو رہے ہیں۔ قوم کی کتبت و افلاس پر کس توجہ سے غور کیا جا رہا ہے دونوں مدرسے جو قائم کئے گئے کس عوبی سے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ سیر سے اوپر لوکیاں تعلیم

پارہی ہیں، یہ رکبیاں جو وقت پر لکھ کر نکلیں گی آپ ہی فرمائیے کیسی داییں اور کیسی دیوایاں ہونگی

مال۔ ”بیٹی مجھے تم سے بحث کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی رائے پر قائم رہو میں اپنی پر مجھے تمہارے معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہ تم کو میرے۔ تمہاری کوششیں اگر قوم کے واسطے مفید ہیں تو غشی کی بات ہے۔ میں اگر قوم کے واسطے مضر ہوں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

بیٹی۔ ”یہ سب بڑی مصیبت ہے کہ جہالت آپ لوگوں کو ایمان کی بات نہیں کہنے دیتی۔ جو خیالات آپ کے دماغ میں ساگئے ہیں اور جو مرض متعدی کی طرح آپ کی گودوں سے دوسروں کو لگ رہے ہیں آپ ان کی خرابیوں کی بھی قایل نہیں۔ جیتک ان کی بچ کنی نہ ہو ہماری کوششیں بار آور نہیں ہو سکتیں۔“

مال۔ ”اب یہ جہالت ختم ہو رہی ہے اور مجھ جیسی دس بیس بڑی بوڑھیاں باقی ہیں۔ اس کے بعد قوم پوری ترقی کرے گی۔“

بیٹی۔ ”ایسا ہوتا تو پھر کیا کہنے تھے۔ بیشک اطمینان ہو جاتا۔ مگر خرابی تو یہی اگر پڑتی کہ یہ نہر علیہ خیالات آپ کے بعد بھی دنیا میں موجود رہیں گے۔ ایک میں سمجھدار تھی کہ آپ کے پھندے میں نہ پھنسی۔ مگر دوسری بالکل آپ کا نمونہ ہے اس کے بچے ہو بہو ماہوں گے۔ اب فرمائیے آپ کے بعد جہالت کا خاتمہ کس طرح ہوا۔“

مال۔ ”مابوس نہ ہو اسی طرح رفتہ رفتہ کمی ہوتی جائیگی اور وہ وقت بھی آجائے گا۔ جب ہم جیسی جاہل عورتوں کا وجود تمہاری اسلامی دنیا میں نہ ہوگا۔“

بیٹی۔ ”لیکن یہ کوشش کیوں نہ ہو کہ آپ ہی اپنے خیالات تبدیل کر لیں اور سچ لیں کہ آپ کے خیالات نے مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچایا۔“

مال۔ ”میں اس معاملہ میں تم سے گفتگو کرنی ہی نہیں چاہتی اور تم خواہ مخواہ سر

ہوئے جاتی ہو۔ مرنے والیاں سو بیوقوف اور تم ہزار عقلمندوں کی عقل مند سہی۔ بحث کی کیا ضرورت ہے“

بیٹی۔ ”اسی کی تو اشد ضرورت ہے۔ کل کے جلسہ میں یہ ریزولوشن پیش ہوا اور بالفاق پاس ہو گیا کہ ہر ممبر جہانک اس کے امکان میں ہو عورتوں کے ان عقائد کو جو محض جاہلانہ ہیں اور جن کی بدولت قوم اس قدر تاراج و برباد ہو رہی ہے زائل کرنے کی کوشش کرے ایسی حالت میں میرا فرض ہے کہ میں سب سے پہلے آپ ہی کی اصلاح کروں، ضرر ظاہر ہے آپ اسپر اعزاز کیوں کرتی ہیں۔ کیا آپ اسلام کی دشمن ہیں۔ اگر آپ ان کو اچھا سمجھتی ہیں تو مجھے بھی بتائیے!“

ماں۔ اگر تم اس قابل ہو نہیں اور اتنا ایمان تم میں موجود ہوتا تو نہ تاہی کا ہے کا تھا۔ یاد رکھو کہ اُن میں اور تم میں فرق یہ ہے کہ وہ خدا کو حقیقی قدرت والا کہتی تھیں اتنا ہی سمجھتی تھیں۔ اُن کو ہر حال میں ہر رنگ میں ہر خوشی میں اور ہر رنج میں خدا دکھائی دیتا تھا۔ سخت سے سخت مصیبت میں بھی ان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ کہیں اس سے بڑی مصیبت نازل نہ ہو جائے حد سے زیادہ خوشی میں بھی یہ کھٹکا اُن کے دل سے رفع نہ ہوتا تھا کہ بڑی قدرت والا اس خوشی کو رنج سے تبدیل دے۔ کہنے کو تو میں بھی اور تم بھی دونوں ہی خدا کو قادر و قدیر سمجھتے ہیں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے قول سے عمل سے بات سے چپت سے یہ ثابت کریں کہ جو سمجھتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔

ابراہیم بودی جو قوت تخت حکومت پر جلوہ گر تھا اگر یہ سمجھ لیتا کہ عزت کے ساتھ ذلت لگی ہوئی ہے اور عزت کا دینے والا ذلت بھی دے سکتا ہے تو اس کی ماں جیلجی نہ سے باہر اگر ہایوں کے قدموں میں گرتی ہوئی تاریخ کو ان الفاظ سے نہ لرز دیتی کہ

”میں ابراہیم کی ماں ہوں“

اسی یقین کا نام مذہب ہے جس کو مرنے والیاں ہر شے سے مقدم سمجھتی ہیں

اور ان کی گھٹی میں ڈالا جاتا تھا کہ وہ مذہب کی وقعت اور خدا کی عظمت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ دیں۔ اس واسطے ان کے لئے جو تجویزیں کی گئیں وہ مذہب کے دائرہ میں، مذہب کے رنگ میں، یا یوں سمجھو اس سانچے میں ڈھال کر سامنے رکھ دیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ہم میں بہت سے نقص ہیں اور ان کی اصلاح یقیناً ضروری ہے لیکن اس کچھڑ میں چند جو ہر بھی میں جن کو کم ماند سمجھ رہی ہو۔ اور درحقیقت وہ کلیچہ سے لگانے کے قابل ہیں۔ یہ اصول جن پر تم معترض ہو باون تو لے اور پاؤرتی کے ہیں۔ تمہاری نگاہ میں، اگر مذہب کی کوئی وقعت تمہارے دل میں، خدا کا کچھ خوف تمہارے دماغ میں، اگر رتی بھر عقل اور تم میں اگر برائے نام انسانیت اور تھوڑی سی بھی نسوانیت ہوئی تو تم سمجھتیں کہ ان کی اصلیت کیا اور حقیقت کیسی ہے ؟

مسافر گیا ہے بھاڑ نہ دو! اس سے مذہب کا کیا واسطہ؟ مگر اس میں جہالت کی کیا بات ہے؟ جاتے وقت چیز بست، اسباب بچھو تا، بیس چیریں باہر ہوتی ہیں۔ اگر غریباں نہ بھاڑ دیا جاتا اور جاتے ہی بھاڑوں ل جاتی تو چھوٹی موٹی چیریں بھاڑ دین کوڑے تک سوزا نہ پہنچ جاتیں شاید کوئی انگوٹھی چھلہ پتہ۔ بالی کا غڈ پتہ بھی غارت ہو جاتا۔ بتاؤ یہ احتیاط کیا بُری ہے؟

چلو آگے برہو۔ شام کے وقت ہرے درخت کے نیچے سر کھول کر نہ کھڑی ہو بیٹی یہ تو موٹی سی بات ہے لڑکی بالیاں شام کے وقت سر گوندھتی ہیں اور جب دونوں وقت۔ ملتے ہیں اسی وقت پرند بیزار لیتے ہیں اگر درخت پر جانور ہوے جو نیا وہ ہرے ہرے درخت پر بیٹھے ہیں اور بیٹا کر دی تو گندھا گندھا یا سر ربا دہوایا نہ ہوا؟ خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی اس میں جہالت کیا ہوئی؟

مسافر کے واسطے چاؤ کی جو کہتی ہو دل میں غور کرو اور خود ہی قائل ہو جاؤ۔ آدمی رات کو مسافر آئے اور پہلے سے خبر بھی نہ تھی کہ کھانے کا انتظام ہو جاتا۔ فرض کرو

مہمان امیر ہے میزبان غریب جس کے پاس پیسہ ہے نہ وقت پر انتظام کر سکتا ہے۔ رات آدمی ہے کچھ انتظام ہو بھی نہیں سکتا۔ میزبان کی غربت کو کس خوبصورتی سے دھانکا ہے کہ صرف چاول پکا کر سامنے رکھ دے ایمان سے کہنا ایک معمولی سی بات نے کتنی خرابیوں کو دور کر دیا ہے

پانی کھڑے ہو کر پینے کے نقصانات تو ظاہر ہیں خود طب کی رو سے ثابت ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا مضر ہے

اسی طرح پاؤں ہلکا رکھانے کی کیفیت ہے ضرورت ہے کہ آدمی اطمینان سے کھائے اور پیئے تاکہ کھانا انگ لگے اور جو مقصد اصلی ہے وہ پورا ہو نہ کہ اور اُلٹا کھانا نہر اور پانی تیر بن کر اترے ۔

کاش تم کو خدا عقل دیتا اور سمجھتیں کہ عورت نہا کر اٹھے تو اس لئے کہ اسکے بچے مر گئے یا مر گیا لگے نہ ہو۔ کتنی معقول تجویز ہے۔ بچوں کی شرط تو برائے نام ہے بہت کم ایسی اللہ کی بندیاں ہوں گی جن کا کوئی بچہ نہ مرا ہو۔ احتیاط دونوں کے واسطے ہے اور اس لئے ہر عورت ایسی حالت میں لگے ملتی ہوئی ہچکچائے گی۔ اب تم اس کی وجہ سنو عورت کے بال نہانے کے بعد خشک نہیں ہوتے اور ان میں نچوڑنے کے بعد بھی پانی کے قطرے وجود رہتے ہیں اگر اس سے کوئی ملیگا یا کسی کو ملنا پڑیگا تو بیشک کپڑوں کے خراب ہونے کا احتمال ہے۔ تم ہی دیکھو کس قابلیت سے اس ضرورت کو پورا کیا اس برائی کا انسداد کیا کہ دونوں میں ایک کرنا گوارا نہ ہو۔

روٹی پر پیاز کھلی تم خود ہی سمجھ لو بُری ہے یا نہیں۔ پیاز کس قدر بو کی چیز ہے اس بہانہ سے اس کو پاس ہی نہ آنے دیا

چار پانی کی پانٹنی خود ہی کھڑی کر کے دیکھ لو۔ کیسی معلوم ہوتی ہے اگر اس منہوس کہہ کر روک دیا تو کیا گناہ کیا ۔

ہاں عورت کے سفید کپڑوں کی بحث ذرا تیز مری ہے میں جانتی ہوں کہ آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں غیروں کے دیکھا دیکھی سفید کپڑوں کے حقوق میں مبتلا ہیں مگر جنہوں نے سہاگ کے واسطے رنگین لباس مخصوص کیا تھا ان کو بیوہ اور سہاگن میں امتیاز کی ضرورت تھی۔ تاکہ خدا کے حکم بیوہ کے نکاح کی تکمیل باسانی ہو سکے اور بیوہ عورت دیکھ سکے کہ اسکا رنڈا یا باسانی تیز ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ خود اسلام عورت سے متوقع ہے کہ مردوں کی طرح ہاتھ کے ناخن سفید نہ رکھے، میں تسلیم کرتی ہوں کہ بعض مرد بھی اب سفید لباس پسند کرتے ہیں مگر کثرت ابھی ان ہی لوگوں کی ہے جو عورت کے رنگین لباس کو سفید پر ترجیح دیتے ہیں یہ سیر بھی دیکھ لو کہ جن کی نقل میں سفید لباس پسند کیا جاتا ہے وہ خود رنگوں کے دلدادہ ہیں۔

”بچہ کے کالے دانہ کی ”رسم تمہاری سمجھ میں نہ آسکی۔ اس سے نفرت گذرے واسطہ نہ سہی مگر اس کا مقصد صرف ہوا کا صاف کرنا ہے کہ بچہ کی ارد گرد ہوا آدمیوں کی کثرت سے خراب نہ ہو یہی کیفیت مولود شریعت یا اور محاسن کی ہے کہ وہاں آدمی زیادہ ہوتے ہیں ہوا خراب نہ ہونے پائے۔

”سننے سر جھاڑو دینا کھلی ہوئی نادانی ہے کہ خاک سر میں جا بیگی اور اگر سر گندھا ہوا ہے تو اور بھی بال برباد ہوں گے“

انگلی چھوڑ کر کھانا تم کو شاید اچھا معلوم ہوتا ہو۔ میری آنکھوں کو تو زہر معلوم ہوتا ہو اور میں اسکو بہت بڑی دتیمیزی خیال کرتی ہوں۔

میٹی ان باتوں پر تم لاکھ جہالت کے آوازے کس لو گران کی نہ میں تم کو کھلتے ہوئے پھول دکھائی دیں گے۔ تم مدرسوں کی جو کھتی ہو تو بیوی جس قدر فیض تمہارے ان مدرسوں سے جاری ہوتا ہے یہ مرنیوالی بیویوں کے ہر گھر سے جاری تھا۔ مشکل سے کوئی معقول گھر ادیا ہوتا ہوگا جہاں ایک آدمہ محلہ کی غریب لڑکی پڑھنا لکھنا نہ سیکھتی ہو ان تم یہ اعتراض

کر سکتی ہو کہ وہ تعلیم صرف کلام اللہ رٹ لینے کی ہوتی ہے مگر میری بیٹی میں تو اچھل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بھی اس سے زیادہ نہیں دیکھتی کہ خط لکھ لیں اور پڑھ لیں تم نے نئی تعلیم پائی ہے اور میں اس نعمت سے محروم ہوں تمہارا جی جو چاہے خانہ داری کے حساب کتاب کے متعلق مجھ سے دریافت کر لو۔ پیسوں کا، روپیوں کا، اشرفیوں کا، آٹے کا، گھی کا، گوشت ترکاری کا تم بھی شاید اتنا ہی حساب زبانی بتا سکو گی جتنا میں، لیکن میں اگر تم سے یہ کہو گی کہ ذرا آیت الکرسی تو پڑھ کر سنا دو۔ تو بغلیں جھانکنے لگو گی۔ تمہارا گھر جس طرح رہتا ہے اور جو ہنر سلیقہ تمہارے گھر سے ٹپک رہا ہے وہ مجھے بھی معلوم ہے۔ جاہل کے گھر سے اپنے تعلیم یافتہ گھر کا مقابلہ کر لو اور فرق کا فیصلہ تم خود ہی کر لو۔ تمہارے ہاں مانا اگر کسی روز نہ آئے تو اللہ چاہے گھر میں کھیاں بھٹکتی رہیں۔ میرے ہاں خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے تم سے ایک آدھ ماہ زیادہ ہی ہے مگر میں جب تک اپنے ہاتھ سے جھاڑو نہ دوں مجھ کو چین نہیں پڑتا۔ تم کو شاید ہسینوں بھی ابو جی خانہ کے جھانکنے کا اتفاق نہ ہوتا ہو گا میں دونوں وقت تمہارے آبا کا سالن خود اپنے ہاتھ سے بگھارتی ہوں اور اس کو اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ تمہارا جس معاملہ میں جی چاہے مجھ سے بحث کر لو۔ یہ تمہارے ابا بھی میٹھے میں ان ہی پر فیصلہ رہا۔ میری آمدنی تمہاری آمدنی سے زیادہ نہیں اور میرا جائز خرچ تمہارے جائز خرچ سے وگنا۔ مگر خدا کا شکر ہے۔ ایک پیسہ کی قرضدار نہیں بلکہ تھوڑا بہت اللہ کا دیا وقت بیوقت کیوا سٹے میرے پاس نکل ہی آریگا۔ بولے جناب آپ بھی کچھ فرایے غلط کہتی ہوں یا صحیح؟

تیرمواں باب

وقت کی پوری روح حکومت کا زبردست اثر، مغربیت ہرزی روح کو غیر ذی روح شخص اور شے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ حد یہ کہ زمین کی پیداوار اور ہوا کا کہ وہ بھی اسی رنگ میں خراب اور تھا۔ اس نہرِ ملامی کا اثر اتنی ترقی کر گیا تھا کہ زمین سے پھول اگتا تھا تو

خوشبو سے محروم اور ہوا میں ملازچکتا تھا تو نفع سے پاک برقی اثر کی طرح یہ رفتار لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہی تھی۔ زادہ کا شوہر احسان تھا تو بے حد سیدھا اور حد سے زیادہ سادہ مگر وقت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ آخر انسان تھا دل بھی تھا اور آنکھیں بھی، دماغ بھی، اور جوانی بھی۔ عمر گزری اس طرح کہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنی اور میں اس کے سوا گھر سے نکلنا قسم اور سیر کو جانا گناہ۔ اب جو پہاڑ پر پہنچا اور یہ جھلا جھلی کے جلوے دیکھے کہ برت کے ٹکڑے، عورتیں شوہروں کے ہاتھ میں ہاتھ دے، کوئی رتنے میں، کوئی ساڑھی میں، کوئی گاڑی میں اور کوئی یوں ہی، سبز پمپ شلٹی پھر رہی تھیں انھیں کھل گئیں۔ نیا نیا آیا تھا تاول تو آدمی تھے ہی نہیں اور جب ہو بھی گئے تو چھانٹ چھانٹ کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملا ان لوگوں سے جو پرانی چال اور دنیاؤسی خیال کے تھے۔ مگر ایک چہ ہی مہینہ بعد جو پہاڑ کی ٹھنڈی ہوا لگی اور منتظر دیکھے یہ کچھ ایک تو انسان اور پھر جوان، طرہ یہ کہ کان میں آسے ترقی کے نعرے وجہ کیا اور سبب کیا کہ دنیا ترقی کرتی اور احسان نہ کرتا! اس احساس کا پہلا نتیجہ اور اس کوشش کا پہلا انجام یہ تھا کہ جو میری اب تک نعمت اور امرت تھی وہ ذلت اور حقارت ہونے لگی۔ یہ تو نہ کر سکا اور کر سکتا بھی نہ تھا کہ ایک دم سے رسی توڑ الگ کھڑا ہو جاتا ہوں اتنا ہونے لگا کہ عیش کے بعد مر کر بھی گھر سے باہر نہ نکلنے والا آدمی ہفتہ میں دو مرتبہ اور کبھی تین مرتبہ تماشہ میں پہنچنے لگا۔ نماز گنڈے دار ہوئی۔ وظیفہ ختم ہوا۔ وہ تھا اور سوری پارک۔ مدرسہ کی حاضری مجبوری ہوئی۔ مگر اسی کی بدولت مل رہا تھا ورنہ اس کا بس چلنا تو اس قطعہ زمین کو جو نوہ جنت تھا چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ کے لئے نہ چھوڑتا۔ چاندنی رات میں جس وقت ترقی پارک کے ہرزہ زمین سے برآمد ہوتی تو آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ زادہ لاکھ بھولی اور ہزار سیدھی تھی۔ مگر میاں کارنگ فوراً مٹا لیا۔ لیکن کیا کر سکتی تھی پردیس کا معاملہ، اجنبی لوگ، کہنی کس سے اور پوچھتی کیا۔ ترقی کا پہلا زور بدظنی اور رعونت ہے۔ احسان نے سب سے پہلے ظن سوسن کی زنجیر تو زنجیر کو شہر سے بدلا اور حکم دیدیا کہ جو بھی گھر

سے باہر نہ نکلے۔ زائدہ میاں کے سامنے اور اسکے حکم کے مقابلہ میں کسی شے کو وقع نہ سمجھتی تھی۔ یہ حکم سر آنکھوں پر رکھا مگر ہمسائی جس کا کھانا دونوں وقت جا کر پکاتی تھی۔ اس حکم سے سخت مصیبت میں پھنس گئی اور تین چار دنوں پر کڑا کے کے فاقے گذر نہ گئے۔ بد نصیب کے دونوں کرہ گئے تھے اسی حالت میں اردھنتی لڑکائی گھنٹی گھنٹاتی دوپہر کو چلی چلا دیوانچ گھر میں تیسرے پہنچیں۔ احسان آڑی مانگ نکالے کف کے بٹن لگا رہا تھا کہ یہ آواز کان میں آئی ”بیٹی اپنے ہاتھ پاؤں کا صدقہ میرے ہاں اگر نہیں اپنے ہی ہاں ڈال دیا کرو ہم روٹی کو ترس گئے۔ بچے بلوں بلوں کرتے پھر رہے ہیں۔ میرے پاس سوادعا کے کیا دھرا ہے خدا کو رش رکھے گا۔ آہی بچی دو دوں نہ اسے پوتوں پھلے اس پر دیں میں تیری عنایت نے ہم مردوں میں جان ڈال دی اور ہم مرتوں کو جلا لیا۔ اوپر خدا اور نیچے تو۔ میرے پابج بچے میرا لنگر خوشہ میری دھکی ہوئی آتما۔ تجھ کو دعائیں دے رہے ہیں۔ اے بگم بھوک کی تکلیف سے چھٹکا لادلو اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کر“

احسان۔ ”یس دوسرے کی بھی سنو انکو اتنی فرصت کہاں؟“

عورت۔ ”اچھا میاں خوش رہو“

احسان۔ ”خوش رہنا اور نا خوش رہنا کیا صرف تمہارے ہی کہنے پر ہے؟“

عورت اتنا سنتے ہی پھر نہ بولی اور جن قدموں سے آئی تھی ان ہی قدموں سے اُٹتی ہوئی۔ احسان کپڑے پہن، سگڑٹ سلگا، چھڑی ہاتھ میں لے ایسی بیجاتے، باہر گئے۔ مگر نہادہ کے کلیجے پر جو چوٹ عورت کے بیان سے لگی تھی وہ اتنی گہری تھی کہ اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے اس نے ہمسائی کو آواز دی اور کہا ”آتما بھیچو۔ خود نماز پڑھی اور دعا لگی کہ ”آہی اگر بری لگی ہو تو معاف کیجہو اور احسان کو اپنے حفظہ امان میں رکھیو“

میاں احسان کی ترقی کی کوشش زبانی جمع خرچ نہ تھا۔ کسی دفعہ قصد کیا کہ علی صورت بھی اختیار کروں۔ مگر ہمت نہ پڑی آخر ایک دن جی کر ڈاکر کے کہہ ہی دیا۔ چلو آج

تم کو بھی نماشہ دکھا لاؤں کیا یاد کرو گی؟

احسان کی خواہش جائز تھی یا ناجائز یہ علیحدہ بحث ہے مگر سوال یہ ہے کہ بیوی بھی اس کی اہل تھی یا نہیں۔ بہر حال زاہدہ جیسی بیوی کو جس کی تعلیم یہ تھی کہ شوہر مجازی خدا ہے تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا احسان لے گیا اور وہ چلی گئی۔ صبح کو جب احسان اٹھا تو بیوی سے پوچھا۔

”کہو تما شے کی بابت کیا رائے ہے کیا رہا“

زاہدہ۔ ”رائے کیا دوں۔ اچھا تھا۔“

احسان۔ اچھا سے کام نہیں چلتا۔ تم اس کے فائدوں پر نظر ڈالو۔ انسانی زندگی میں جو خرابیاں اور نقصان ہیں ان کا انداز کس خوبصورتی سے کیا گیا تھا واہ واہ برائی کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے۔ تم لے دیکھا شراب کا نتیجہ کس قابلیت سے دکھایا کہ بھرپنے کو جی نہیں چاہتا؟

زاہدہ۔ ”مگر جہاں بہت سی برائیوں سے دل ہٹ سکتا ہے وہاں بعض خرابیاں کی طرف طبیعت کے راغب ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ حسن و عشق کی داستان جو تمام تما شہ کی جان تھی بالکل وہی معنی رکھتی ہے جو آجکل کے ناول۔ جس طرح اس قسم کی لغو کتابوں کا عورتوں کے ہاتھ میں دینا مضرب اسی طرح تما شہ بھی مفید نہیں۔ احسان۔ ”تو کیا تم دوبارہ چلنا نہیں پسند کرتی؟“

زاہدہ۔ ”اگر تم کہو گے تو سراسر آنکھوں سے تعمیل کروں گی“

اس واقعہ کو مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا۔ ایک روز احسان بیٹھا کھانا کھا رہا تھا رات کے شاید آٹھ بجے میں گئے کہ ہسانی کی ٹرکی نے آکر کہا۔

”اُناں ایک پان کا کھڑا مانگ رہی ہیں۔ آج میاں احسان کو اپنا پرانا حکم یاد آگیا اور بیوی سے پوچھا۔“ ابھی تک تمہارا یہ لغو سلسلہ برابر جاری ہے؟“

”زاہدہ۔ کس قسم کا سلسلہ؟“

احسان۔ ”وہی روٹی پکانے کا؟“

”زاہدہ۔ تمہارے منع کرنے کے بعد کیونکر ممکن تھا۔ میں نے اسی روز سے

وہاں جانا بند کر دیا۔ اب وہ اپنا آٹا بھیج دیتی ہیں میں یہیں پکا دیتی ہوں“

احسان۔ ”مگر میں تو منع کر چکا تھا؟“

”زاہدہ۔“ تم نے جس بات کو منع کیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی۔ گو حکم تم نے کچھ نہیں

دیا مگر تمہارے اس فقرے سے کہ ان کو اتنی فرصت کہاں ہیں یہ سمجھ گئی تھی کہ تمہاری

مرضی نہیں اسلئے میں نے جانا آٹا بند کر دیا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تمہارا یہ منشا ہے

تو میں یہ بھی ختم کر دیتی۔“

احسان۔ ”تمہارے بیان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ تم اتنا تو سمجھ گئی

تھیں کہ مجھے یہ سلسلہ پسند نہیں۔ تم کو ان کی خدمت میں کیا مصلحت دکھائی دی“

”زاہدہ۔“ آئندہ یہ بھی نہ کروں گی“

احسان۔ ”اب تک جو کیا؟“

”زاہدہ۔“ غلطی ہوئی“

چودھواں باب^{۱۲}

مسٹر حرن کی فانی آمدنی تو کچھ بھی نہیں، جو کچھ اگلے تللے تھے وہ باپ کی کلانی اور

جائداد کے برتنے پر بیوی پہلے تو میاں کو لیکر آگے ہوئیں۔ اس کے بعد فرض خیر و رع ہوا اور

نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو کچھ گھنا بآسا پاس تھا وہ اصل اور سود میں فنا ہوا۔ بیٹے اور بیوی کا یہ

انجام دیکھ کر باپ اور ماں دونوں رنجیدہ ہوئے۔ بابا کی یہ خلگی اگر حرن کا اپنی قوت بازو

کا رویہ ہوتا تو شاید میاں بیوی کی نگاہ میں زیادہ وقعت نہ رکھتی۔ مگر اب تو مصیبت یہ

آئی کہ خفگی فقط خفگی ہی تک محدود نہ رہی۔ بلکہ عمل میں بھی آگئی اور دونوں نے اپنا ہاتھ
 کھینچ لیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ خود ہوئے مفلس، قرضخواہوں کا ہوا تقاضا، پھٹکے چوٹ گئے۔ اب
 بیوی کے سامنے میاں اور میاں کے سامنے بیوی تھیں۔ وہ اسکو گنہگار سمجھتا اور یہ اس کو
 حسن پر یہ مصیبت پہاڑ کی طرح گری اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس تغیر کا سبب، اس انقلاب
 کی وجہ، اس بربادی کا باعث، بیوی اور صرف بیوی ہے۔ بابا پ اس کی بدولت جھوٹے
 قرض اس کے طفیل ہوا، تقاضے اس کے کارن ہوئے، یہ مانا کہ ترقی یافتہ انسان تھا، مگر تھا
 انسان۔ محسوس کیا جوڑی، اور سمجھا جو کائی۔ بیوی سے بار بار نرمی سے اور آہستگی سے کہا بھی اور
 بتایا بھی کہ اب یہ یحیٰن نہ نبھنے والے اور یہ ڈھنگ ٹکنے والے نہیں۔ ہاتھ روکو اور دل اردو۔
 قرضخواہوں نے دم ناک میں کر رکھا ہے ایک ڈاکٹر کا خرچ وہ کر سچے لگی ہے۔ کہ کسی طرح
 ختم ہی نہیں ہوتی۔ صحت اگر اس قدر روپیہ خرچ کرنے سے میسر آتی ہے تو میری رائے
 میں قدرت سے زیادہ ظالم کوئی طاقت نہیں، مگر بڑھا ہوا دل، پڑا ہوا لپکا، بیوی کی سمجھ
 میں آئی کیا خاک اور سنتا کون کبجنت۔ حالت روز بروز ردی اور معاملہ ساعت بہ ساعت
 خراب ہوتا گیا اور وہ دن بھی آ پہنچے کہ قرضخواہوں کا تار صبح سے جو شروع ہوا تو شام تک
 نہ ٹوٹا۔ واقعات کی اطلاع بابا دو لبوں کو ہو رہی تھی انہوں نے حسن کو بار بار متوجہ کیا اور وہ
 متوجہ ہوا۔ مگر شاہدہ کو متوجہ کرنے والا کون تھا یا ہوتا۔ ما تو اس قابل تھی ہی نہیں۔ اگر کوئی
 تھا تو لے دے کر ایک باپ جو کہہ بھی سکتا تھا اور کر بھی اور شروع شروع میں دوا یک
 دفعہ کہا بھی مگر دیکھا یہ کہ اس اللہ کی بندی نے اس کان سنا اور اس کان اڑا دیا۔
 تعمیل نو دکنار بحث پر تیار اور گہڑے پر آمادہ ہو گئی تو گھٹی سادہ لی۔ اور سمجھ لیا کہ جیسا کہ یگی
 دیا بھر گی +

وقت کی بات ہے ان ہی دنوں میں غانساں کو تنفس کا دورہ ہونا تھا۔ مگر بڑھا
 آدمی، پرانی آنکھیں دیکھا ہوا آنا اور نشتم پشتم پکا رہا۔ جب بخار آنے لگا تو مجبوراً ہچھوڑا

اب بچانے والا کوئی نہ تھا ایک وقت تو یوں لگا کہ بہرے اور مشعلی نے مل کر کچھ کر دیا مگر وہ کھانا کیا فقط نام کھانے کا تھا، گوشت ہے وہ جلا ہوا، شوربا ہے وہ بسا نہ، رہے چاول وہ گلہتی بھی اودھ کے بھی۔ شاہدہ نے کئی جگہ خط لکھے۔ دو ایک سے زبانی بھی کہا۔ مگر بازار کی ترکائی یا گلی کا سودا نہ تھا کہ دام نیچے اور منگولیا۔ دوسرے وقت بھی شاہدہ کو خود پکا پاڑا۔ یہ پہلا روز اور پہلا موقع تھا جب شاہدہ کی حیثیت کہ تین تین ہندویوں کا مصاحفہ ہیں۔ بہرے کو دیا۔ تو مرجیں لالہ اور مشعلی سے کہا تو نک نہر۔ خود پیسے بیٹھیں مگر جس کا کام اسکو سہاؤے کہنیوں تک مرجیں لگ گئیں اور پھر بھی کھانا ڈھنگ کا نہ جڑا۔ متواتر چار پانچ وقت یہی مصیبت رہی۔ شاہدہ سمجھ رہی ہے کہ میں نے میاں کو مول لے لیا اور وہ احسان کیا کہ عمر بھر کان نہ ہلا سکے۔ دونوں وقت اس گرمی میں کہ آگ کی طرف دیکھا نہ جائے کھانا پکا رہی ہوں مگر حسن خیال کر رہا ہے کہ ایسی عورت بھی کس کام کی جس کو کھانا تک پکانا نہ آتا ہو۔ شاہدہ جلی ہوئی۔ حسن بھلسا ہوا۔ دلوں میں غبار دونوں کے۔ وقت کی دیر اور موقع کی ضرورت تھی۔ کیفیت اس وقت دونوں کی یہ تھی کہ پھوڑا پکا پکایا تھا۔ نشتر دیا اور پھوٹا۔ شاید پانچواں روز تھا کہ حسن کھانا کھانے بیٹھا۔ شور بے کا پہلا ہی چمچ لیا تو بھکرانہ نے چمچ اور شور با دونوں چھٹوا دیئے۔ چاولوں پر جھکا تو پیچھے کباب کو چکھا تو پھیکا۔ کہنے لگا۔

”یہ پانچ روز سے متواتر قاتے پڑ رہے ہیں اگر باورچی بیمار پڑ گیا تو اب بھوکا ہی مرے گا“
شاہدہ۔ ”باورچی کی بیماری کی جس قدر میں ذمہ دار ہوں اس قدر تم۔ بھوکے اگر تم ہوتی ہیں بھی ہوں۔ افسوس ہے تمہاری طبیعت پر اور حد سے زیادہ تمہاری قدر دانی پر کہ آج پانچ روز سے میں خود سخت سے سخت مصیبت اٹھا کر محض تمہارے واسطے چلے کے آگے مر رہی ہوں۔ بجائے اس کے کہ تم شکر کرتے اور اُلٹے شکایت کرتے ہو۔“

حسن۔ ”تم کہی لغو باتیں کیا کرتی ہو یہ تمہارا فرض ہے کسی پر احسان نہیں۔ میں تمہاری ضرورتیں پوری کرتا ہوں۔ روپیہ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ کیا تم پر احسان ہے؟“

اسی طرح اگر تم کھانے کا استقام کرو یا خود کچاؤ تو تمہارا فرض ہے اور ہونا چاہئے۔
شاہدہ۔ تو کیا بیویاں اس لئے کی جاتی ہیں کہ وہ چولھے میں پھکیں اور بھاڑیں
 بھنیں۔

حسن۔ یہ میرا مطلب نہیں ہے۔ اگر کھانا پکانا یا پکوانا ایسی سخت مصیبت
 ہے تو اس سے بہت زیادہ مصیبت کے کام مرد بھی کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے۔ کہ
 عورت پر احسان کر رہے ہیں۔

شاہدہ۔ تمہاری گفتگو ایسی تیز ہے کہ افسوس میں برداشت کے
 واسطے تیار نہیں۔

حسن۔ تمہاری حالت اس قدر خراب ہے کہ مجھ میں اب سہار کی ہمت
 نہیں۔

شاہدہ۔ اس کا فیصلہ یہ بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر خوش، میں اپنے
حسن۔ اگر یہ ہی بہتر فیصلہ ہے تو سر آنکھوں پر۔

شاہدہ۔ خیر مجھے زیادہ بحث کی ضرورت نہ فرصت۔
 اتنا کہ اگر شاہدہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرہ میں آ بیٹھی۔ سوچنے لگی کہ چچہ مہینہ سے
 حسن کا مزاج آسان پر ہے۔ میرا کہیں جانا اسے ناگوار۔ کسی سے ملنا اسے ناگوار۔ حدیہ
 ہے کہ میرا کپڑا، میرا خرچ، میرے نوکر چاکر کوئی بھی اسے ناگوار نہیں۔ مجھے معلوم ہے
 کہ وہ ٹکڑے کر رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں بیوی ہوں مگر لونڈی نہیں۔ حسن نے
 اپنے دل میں سمجھا لیا۔ میں اسے وہ مزہ چکھاؤں کہ عمر بھر یاد کرے۔ اس کا کیا قصور۔ قصور
 مسلمانوں کا ہے وہ بھی آخر مسلمان تھا مسلمان نکلا۔ سنتا ہے دیکھتا ہے کہ ہر عورت لونڈی
 اور ہر بیوی باندی۔ جب ہم ہی اپنی حالت درست نہ کریں اور مردوں کو نہ بنادیں کہ ہم
 بھی کچھ طاقت رکھتے ہیں تو شکایت فضول۔ اگر آج تمام مسلمان عورتیں یہ معاہدہ کر لیں

کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں مردوں کے ساتھ برابری کی حالت قائم رکھیں گی تو چار دن میں مردوں کے محلے کے سے بل نکل جاتے ہیں۔ خیر میں اسکا علاج کرتی ہوں اور ضرورت ہے کہ خود کشی کر کے ایک ایسی مثال قائم کر دوں کہ مرد آئندہ ہر عورت سے بات کرتے ہوئے تھرائیں۔ یقیناً میری موت بہنوں کے واسطے مفید ہوگی۔ مگر مائیں اس سے حسن کا کیا بگڑے گا وہ توجہ میں سے اپنا گھر بے لگا۔ اس کو عورتوں کی کیا کمی۔ مجھ کو اپنے طبقہ سے یہ امید نہیں کہ میں تو ان کے واسطے اپنی جان گنواؤں اور وہ صرف انسا ہی انتظام کر دیں کہ حسن کو بوی نہ ملے۔ خدا سمجھے ان کجخت مسلمانوں سے کوئی کام ہو آپ کرتے ہیں نہ دوسرے کو کرنے دیتے ہیں۔ مائیں تو یقیناً میرے ساتھ ہونگی اور حسن کو بیٹی نہیں مل سکتی۔ مجھے اُمید ہے کہ اب کے سالانہ جلسہ میں یہ تجویز بھی منظور ہو سکتی ہے مگر بیٹی پر باپ کا بھی تو حق شرع اسلام نے لگا دیا ہے۔ سینکڑوں باپ قادی پر رضامند ہو جائیں گے اور بل بل کرتے بیٹی دیں گے۔ خیر مرنے کی ضرورت نہیں مجھے زندہ رہنا اور اس کو مزہ چکھنا چاہیے یہ ناممکن ہے کہ حسن میری زندگی میں دوسرا نکاح کر سکے میں وہ مسلمان عورت نہیں کہ اس زہر کو ہنسی خوشی پی لوں۔ لیکن میرا اب اس کو بھی میں رہنا کچھ ٹھیک نہیں۔“

”ہاں! اتنا کہہ کر شاہد نے کچھ سوچا اور یہ کہتی ہوئی اُنھی ضرور ضرور“

ایک چھوٹا سا تھملا چڑے کا ہاتھ میں اور بچہ کو ساتھ لے اُتر کر گھر کی گاڑی چھوڑ کر ایہ کی گاڑی میں بیٹھ سیدھی کلب پہنچی۔ کچھ دیر ٹھہر کر نیشن آئی اور ایک ہسپتال سے ملنے دوسرے درجن میں منجہ احمد آباد روانہ ہوئی۔ گاڑی کا ہندوستانی محافظ دیکھ تو بہت دیر سے رہا تھا۔ مگر اتنا سننے ہی۔

”ہم کو پانی کی ضرورت ہے“

بے خاشا لپکا اور فوراً پانی لیکر حاضر ہوا۔ شکریہ ادا ہوا۔ ایک آدم بات بھی ہوئی ادب سلسلہ

یہ شروع ہوا کہ جہاں گاڑی ٹھیرتی کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی ضرورت سے آتا اور ایک آدھ بات پوچھ پچھا چلا جاتا۔ شاہدہ کو اس سے پہلے میوں کے ملنے کا اتفاق تو بہت ہوا تھا اور وہ ان کے غلق کی بہت مداح تھی مگر آج صاحب کے اخلاق کی بھی وارد دینی پڑی جو تھینک یو تھینک یو تیں ادا ہو رہی تھی۔

صاحب کو بھی اسد آباد تک گاڑی کے ساتھ جانا تھا۔ اور یہ معلوم کر کے کہ شکار بھی وہیں جاتا ہے اور یہ بے وارنی اپنی ہیلی مسرنصیر یوسف کے ہاں جاتی ہے کہنے لگا کہ آپ تو میری بہن ہیں۔ مسرنصیر میری حقیقی بہن ہیں اب آپ کو تار دینے کی ضرورت نہیں پروا نہ کیجیے۔ میں حاضر ہوں۔

اب شاہدہ کو پورا اطمینان ہو گیا احمد آباد پنج ٹرین سے اُتر گاڑی میں بیٹھا ایک مکان میں جا آئیں۔

شاہدہ۔ ”برادر! اس گھر میں عورتیں مطلق نہیں۔ مسرنصیر کہاں ہیں؟“
 برادر۔ ”وہ ایک شادی میں گئی ہوئی ہیں۔ میں نے ان کے بلانے کو آدمی بھیج دیا۔“
 شاہدہ۔ ”اوہ! آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ تھینک یو تھینک یو۔ برادر تھینک یو۔“
 برادر۔ ”نہیں نہیں سسٹر تکلیف کی کچھ بات نہیں۔“
 شاہدہ۔ ”مگر اور کوئی بھی یہاں نہ رہا سب چلے گئے۔“

برادر۔ ”حقیقی بھتیجے کی شادی ہے۔ وہ آجائیں تو پھر میں بھی جائوں۔ دو دروازے کی چھٹی میں نے بھی اسی واسطے لی ہے۔ آپ غسل کر لیجئے یہ سامنے غسل خانہ ہے میں باہر چلا جانا ہوں۔“

برادر باہر کر ٹہلنے لگے۔ دو تین گلاس پئے۔ شاہدہ اندھا کر نہائیں۔ ڈو جڑے ساتھ تھے۔ کپڑے بدلے بال درست کئے اور مسرنصیر کا انتظار کرنے لگیں۔

انور کا فظ، کیسا ہی ہشیار مرد ہو مگر شاہدہ بھی زیادہ بر وقوف عورت نہ تھی

آٹھ بجے گاڑی سے اُتری۔ جب رات کے گیارہ بج گئے اور اُس نے دیکھا کہ عورتوں کا پتہ نہیں اور یہ کبخت پیٹ پکڑے پکڑے پھر رہا ہے تو اتھاٹھنکا۔ کچھ دیر ٹہلی اور سوچا۔ گھڑی دیکھی تو بارہ بجنے والے تھے۔ اب انور کھانا لیکر آیا تو سب بازار کا۔ خبیہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا کھانے نے شبہ کو یقین بنا دیا۔ انور کسی ضرورت سے باہر گیا دو تین گلاس اور ڈانسنے۔ شاہدہ نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور جھٹ دروازہ بند کر کندی لگا لی۔ انور یہ رنگ دیکھ بہت سٹ پٹایا۔ منت کی ساجت کی اڈرایا دھڑکایا۔ اور جب کچھ بس نہ چلا تو کہنے لگا لیجئے وہ آگئیں۔“

”آگیں دروازہ کھولے۔“

شہادہ - ان کو دروازہ کھسا آنے دیجئے ۔

الور: آپ دروازہ تو کھولے۔“

شایدہ۔ ان کو آنے تو دیجئے :

کوئی گھنٹہ بہر تک یہ بحث ہوتی رہی۔ جب انور بالکل ہی ناامید ہوا
تو دبا کر دو گلاس اور پئے اور کوٹھے پر چڑھ کر چھوٹی چھوت پر آدم سے نیچے۔ اب شاہد
تھر تھر کانپ رہی تھی جس قدر منت پیلے انور نے کی اتنی بلکہ اس سے دگنی شاہد نے
مگر جس طرح وہ بے سود ہو گئی۔ اسی طرح یہ بیکار۔ انور شراب کے نشہ میں چور تھا
آگے بڑھا۔ چلانا چاہتی تھی کہ ظالم نے سوتے بچے کو گردن سے پکڑ کر اٹھایا روشنی
دھڑا دھڑا ہوا ہی تھی دیکھتی ہے تو تیز جاتو انور کے ہاتھ میں موجود سے بچہ بے خبر
پڑا سوتا تھا اس ناگہانی مصیبت سے آنکھ کھل گئی تو ظالم کے پنجہ میں ٹپ رہا تھا!
انور! اگر تیرے دل میں رحم نہیں ہے تو میں اپنی جان پر کھیلتا ہوں مگر سب
سے پہلے تیری آنکھوں کے سامنے تیرے کلیجے کو ٹکڑے کو بکری کی طرح ذبح کر دوں گا
یہ صحن اس معصوم کے خون سے اور تیرے کپڑے اس سے لال ہوتے ہیں۔

بچہ نے حسرت بھری نظروں سے اُکو دیکھا۔ گرفتِ تشہ کی تھی۔ غصہ کی تھی۔ سخت تھی۔ معصوم آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ بے بس تھا، مجبور تھا، لاچار تھا، نیم ترقی یافتہ مال کے سوا صرف نیم کی بیاں اور آسمان کے تارے اس دہشت ناک منظر کو دیکھ رہے تھے عجب وقت اور نازک حالت تھی۔ جانی تھی کہ غمغریب یہ پھول اس جفا کار کے ہاتھوں پا مال ہوگا۔ امتاکی ماری بلبلائی تھی۔ گڑگڑاتی تھی، تڑپتی تھی، روتی تھی، یہاں تک کہ چاقو کی دھار معصوم کلیجہ کے پاس چکی اور اس چمک نے بد نصیب اُکو فریبی برادر کے قدموں میں گرادیا۔ روتی اور رو کر کہا ”مجھ پر رحم کر۔ یہ تین بچوں میں ایک بچا ہے۔ دو گنو اگر یہ صورت اتنی دیکھی ہے۔ میں وہ بد نصیب ہوں جو اپنے ہاتھوں وہ تقدیر پھوٹی ہوں جو اپنی عقل سے اس آنکھوں کے تارے کو پھولوں کی سیج سے اٹھا کر اس قتل میں لائی۔ اور اپنی نادانی کی بدولت اس بگناہ ہستی کو تیرے قبضہ میں دیدیا! دیکھ ظالم اس بچہ کو دیکھ! یہ ڈر رہا ہے۔ چھوڑ دے، بند میرے بچہ کی گردن آزاد کر دے۔ یہ بگناہ معصوم دہل رہا ہے اس کا دم نکل جائے گا۔ اس کا گلا گھٹ رہا ہے اس کی جان فنا ہو جائیگی۔“

انور ”مگر میری حالت اس سے بدتر ہے۔ تڑپ رہا ہوں مر رہا ہوں۔ تیرے قدموں میں سر ہے تیرے ہاتھوں میں زندگی ہے۔ رحم کر میں اس سے بہت زیادہ رحم کا مستحق ہوں۔“

شاہدہ ”چھوڑ دے۔ اود غاباز چھوڑ دے او متکار چھوڑ دے دیکھ اس کی آنکھیں نکل پڑیں۔“

انور ”کبھی نہیں ہرگز نہیں تو کتنے ہے تو پتھر ہے۔ تو اس سے زیادہ سزا کی مستوجب ہے دیکھ کیا ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے اگر یہ واقعی تیرا بچہ ہے۔ اور تو اس کو بچنا چاہتی ہے تو یہ گھر اور اس گھر کا مالک دونوں تیرے غلام ہیں تو یہاں رہ۔ آرام کر۔ حکومت کو خوش رہ، اور خوش رہنے دے۔“

شاہدہ - "تو اس بد نصیب پر اور اس بیوقوف پر جو محض اپنے تہیہ میں گھرے نکل کھڑی ہوئی رحم کر اس بچہ پر جس کا باپ موجود اس عورت پر جس کا شوہر زندہ اس پر جو شریف کا بچہ اس پر جو رئیس کی بیوی ہے رحم اور اپنی شرافت سے مجھ کو وہ وقت نہ دکھا کہ میں دنیا سے نامراد نصرت ہو جاؤں۔ میں اب بھی اگر ایمان کوئی چیز ہے تو عزیزوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں میرا کلیجہ نکل رہا ہے میرا سر تیرے قدموں میں ہے اپنے قصد سے باز آ اور اس بچہ کو چھوڑ دے"

رات کا پچھلا پہر تھا۔ خلق خدا نیند کے فرسے نے رہی تھی مغرب کی اندھا دھند تقلید کرنے والی ترقی یافتہ لڑکی کی آواز ہوا میں گونجی۔ اس کے پاس اس کے سوا کیا تھا کہ پڑوسیوں کی مدد لے۔ چیخا شروع کیا۔ لوگ دوڑ پڑے اور دوازہ بند تھا۔ توڑا اندر گھسے دیکھا اور نشہ میں چورا عورت حیران، بچہ بے ہوش! حال پوچھا۔ افسوس کیا اور معاملہ پوچس کے سپرد ہوا اور اندر کو سزا ہوئی۔

دراصل کے وقت

فیصلہ کا ایک حصہ جو جج نے لکھا یہ تھا۔

عورت کی داستان نہایت درد انگیز ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی کی دھن اور تعلیم کے شوق نے اس کو یہ دن دکھایا مگر ایسا کہنا تعلیم پر زبردست حملہ ہوگا۔ مسلمانوں میں تعلیم نسوان کا حکم صاف ہے اور ان کے ہاں ایسی ایسی عورتیں گزری ہیں جن کے سامنے جیتے جیتے عالموں کی گردنیں ہمیشہ جھکیں۔ مسلمان قوم ان امانت خاہن کی ہستی سے لبریز ہے جن کے نام بساطِ علم پر آفتاب و ماہِ تاب کی طرح چمکے اور دکھے۔ جب وقت نے ان کی حکومت کا پاسہ پلٹا اور حاکم سے محکوم، بادشاہ سے رعیت، اور امیر سے فقیر ہو گئے اس وقت ان کے پاس صرف ایک چیز رہ گئی

جو عورت کی عصمت تھی۔ اب ان کی تمام توجہ اس طرف مبذول ہوئی
 قانون ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور وہ سنرائیں جو اسلام نے ان
 جرایم کے واسطے مقرر کی تھیں۔ ان کے دسترس سے باہر تھیں۔
 اسلئے اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ پردے کو سخت کریں۔ اور اس طرح
 خوانین کو ایسے مواقع میسر نہ ہونے دیں جو اس قسم کے جرائم کے محرک
 ہو سکیں اس میں شک نہیں کہ اس طرح انہوں نے عورت کو اس
 آزادی سے کچھ نہ کچھ محروم کر دیا جو اسلام نے اس کو عطا کی تھی مگر
 اسکا معاوضہ انہوں نے دوسری صورت میں کیا اور اس کا اعزاز و احترام
 اور اعتبار سے بڑھا کر اس کی کمی کی تلافی کر دی۔ کچھ دوسری قوموں کے
 میل جول کا اثر تھا کچھ وقت کا مطالبہ، اب مسلمانوں میں ایک فریق ایسا
 پیدا ہوا جس نے اس تجویز کو غلطی پر محمول کیا اور سمجھا کہ ہماری عورتیں
 جاہل ہیں۔ ان کو بڑھا لکھا کر رہی حقوق دینے چاہئیں جو عطیہ اسلام
 میں اس مقصد کے واسطے انجمنیں قائم ہیں اور اخبار کام کر رہے ہیں۔
 مگر اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصول مذہب اس فریق کے پاس سے
 رخصت ہوا اور اس زبردست قرآنی کے بعد بھی ان کو جو کچھ میسر آجکا وہ صرف
 اتنا کہ اردو کی دو چار الٹی سیدھی سطریں لکھ سکیں اسی کوشش کا نتیجہ یہ
 بد نصیب ماں شاہدہ بھی ہے۔

پندرہواں باب

”ایسی ناہنجار لڑکی خدا دشمن کو بھی نہ دے سچ پوچھو تو کتبہ اور برادری کیا تمام دینا
 میں ناک کٹ گئی۔ ایسا واقعہ میں نے تو کبھی عمر بھر سنا نہیں جو خدا نے اپنی آنکھ سے

دکھایا۔ میرا بس چلتا تو اس شادہ نامراد کو نصیر آباد ہی دفن کر دیتا۔ یہ تمام نتیجہ تمہاری غفلت کا ہے کہ تم اس سے ہمیشہ الگ رہیں اور ان کمبخت نرسوں مسوں نے اپنے رنگ پر ڈھال دیا۔“

بیوی۔ اگر تمہاری یہ رائے ہے تو سچ ہوگی۔ میں اس کا کیا جواب دوں۔ جس روز سے سنا ہے جو کچھ دل پہ گزری ہے میں ہی جانتی ہوں۔ دنیا آنکھوں میں اندھیرے حرام موت نہ ہوتی تو میں تو کچھ کھا کر سورتی۔“

میاں۔ غضب یہ ہے کہ اب بھی کمبخت کی آنکھ میں میل اور تیوری پرل نہیں۔ وہی کلا اردو ہی زبان۔ اگر تعلیم کا انجام یہ ہے تو یقیناً تعلیم حرام۔“

بیوی۔ تعلیم کا نتیجہ ہرگز یہ نہیں ہو سکتا۔ یوں کہو کہ طریقہ تعلیم ستم نہیں۔ جس طرح تعلیم دینی جائے اس طرح نہیں ملتی اور جو دھنگ زہریلے ہیں انہیں سے کام لیا جا رہا ہے نتیجہ تو یہ ہونا ہی ہے۔“

میاں۔ یہ تمہاری شاگردیں کمبخت اس قدر چلاتی ہیں کہ بات کرنی بھی مشکل ہے۔ ذرا ان کو خاموش کر دے۔ کان کے پردے پٹھے جاتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کیا مصلحت ہے کیا تم کو آستانی مہری کی روٹی کھانی ہے جو یہ اتنی ساری پال رکھی ہیں۔ بڑھانے لکھانے کا نتیجہ آنکھ سے دیکھ لیا کان سے سن لیا۔ اب تو یہ سلسلہ ختم کر دو تمہارے یہاں یہ خاندانی مرض ہے۔“

بیوی۔ یہاں تک فوبت پہنچ گئی اور اب تک تم معاملہ کی تہ کو نہ پہنچے۔ اس تعلیم کا نتیجہ خراب نہیں ہو سکتا یہ اسلام کا عین منشا اور ہماری ضرورتوں کے قطعی مطابق ہے۔ لڑکیوں کو میں ابھی خاموش کر دیتی ہوں۔ مگر اس طریقہ کو قابل اعتراض سمجھنا غلطی ہے مبارک ہے وہ گھر جہاں خدا کے مقدس الفاظ کانوں میں آئیں اور عاجز بندے اس زبردست طاقت کے سامنے معجز کی زبان کھولیں۔ یہ تعلیم ان کی دنیا اور دین دونوں

کی فلاح کا باعث ہے۔ خرابی آن کر یہ پڑی ہے کہ تمہارا وہ فریق جو تعلیم جدید کا دلدادہ ہے اصابتِ پر غور نہیں کرتا تم جس بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو چاہو لا کر ان سے مقابلہ کرو تو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ تعلیم نسواں جائز بلکہ ضروری اشد ضروری مگر طریقہ تعلیم یہ مستحسن اور وہ مکروہ

”بیوی کی گفتگو ابھی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی۔ کہ ایک لڑکی سامنے آئی اور کہا ظہر کی اذان ہو رہی ہے“

بیوی۔ ”تم نے دیکھا اسکی عمر مشکل سے سات برس کی ہوگی مگر اس کے دل میں نماز کا شوق اس قدر کیونکر پیدا ہوا۔ اصل میں نماز کے بعد میں ان کے سامنے کہانی کے طور پر کچھ گزشتہ واقعات بڑی بوڑھیوں کے جو میں نے دیکھے اور سنے بیان کیا کرتی ہوں اس وقت تو یہ کہانیاں ان سے نماز پڑھواتی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ عادت ان کی طبیعت میں رفتہ رفتہ اس قدر پکی ہو جائیگی کہ خواہ دنیا کی کوئی چیز بہتر سے بہتر ان سے چھوٹ جائے۔ مگر نماز نہ چھوٹے گی۔ اگر تم کو فرصت ہو تو آؤ آج اس چھوٹے سے مکتب کا بھی تماشا دیکھو۔

لڑکیوں نے جھپا جھپ و غوغا کر کے قرآن شریف جزوان کر الماری میں رکھے تختیاں کونوں میں کھڑی کیں۔ اور کہا استانی صاحب بی بی نور کا حال آگے فرمائیے“

استانی۔ ہاں تو بیٹو! خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے جب ان کے میاں

کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تو نوکری جاتی رہی۔ دن بھر گھر میں سرمہ اندھلے اتوانی کھڑائی لئے پڑے رہتے۔ مرد کی عزت کمائی سے ہے

جب اس قابل نہ رہے تو وہ غصہ طغیانی سب جاتا رہا۔ بچے سر پر چینی اور بچارے

اُت ذکر تے۔ یادہ بندھا بندھی کہ ادھر انہوں نے گھر میں قدم رکھا اور ادھر بیوی بال بچوں کے منہ سل گئے کس کی اتنی مجال تھی۔ کہ سانس بھی دور سے لے لیتا۔ معلوم ہوتا تھا

نادر شاہ بیٹھے ہیں۔ یا اب یہ کیفیت ہوئی کہ لڑکے اور لڑکیاں سر پر ڈھنڈورہ پہٹ رہی ہیں اور وہ پڑے سُن رہے ہیں۔ ساٹھ روپے مہینہ کے نوکر رہے اور اوپر کی بھی تھوڑی بہت آمدنی تھی۔ مگر ایسے فضول خرچ اور اتنے بے ڈھنگے کہ کبھی وقت بے وقت کے واسطے کچھ رکھا ہی نہیں۔ ایک یہ مرض دوبارہ چھینے کا تھا کہ کبھی گھر میں خالی آتہ نہ گئے۔ فصل کی ترکاری اور موسم کا میوہ رومال میں ضرور ہوتا تھا۔ رات کا دودھ کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ وہ بھی یہ نہیں کہ گھر میں، وٹل سبکے رات کے چھ پیسے رومال میں بائد سیدھے حلوائی کی دوکان پر۔ دو چار یا دوست اور ہیں ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہیں اور سڑک پر کھڑے دودھ اُزار رہے ہیں۔ پنی چکے تو سب نے اپنا اپنا کلہر ڈھینکا۔ جس کی آواز زور کی ہوئی وہ ہی اپنے فن کا اُستاد۔ مختصر یہ کہ اسی پچاسی روپیوں میں بیوی نور کے پلے کوئی پچاس روپے پڑتے ہو گئے۔ پانچ بچے دو میاں بیوی ایک بڑیا ماما آٹھ دم تھے، لاکھ سستا ساں اور بچے دن تھے۔ مگر کپڑا لٹا، کھانا پینا جیتے دم کے ہزار خرچ تھے۔ بچاری جس طرح ہوتا شتم بستم تذکر تیں ہاں موقعہ جب ملتا۔ رُخ جس وقت دیکھتیں یہ ہیشہ کہیں کہ خدا کے واسطے کچا ساتھ ہے۔ دو دو لڑکیاں لگے ہیں اس کھانے پینے کو کون دیکھتا ہے۔ کچھ تو آگے کی بھی سوچ کرو۔ مگر وہ اللہ کے بندے تو ایسے کافل میں رومی ٹھونس کر بیٹھے کہ کبھی دمیان ہی نہ کیا۔ نوکری گئی تو نکل تیرہ روز کی تنخواہ چڑھی ہوئی تھی وہ کے دن کی۔ اب پانی اترا تو آنکھیں کھل گئیں۔ بیوی سے کچھ بولنے تو کس منہ سے اور بچوں سے کہتے تو کس برتن پر۔ چپکے پڑے رویا کرتے ساری رات جاگتے اور اپنی غلطی پر سچپاتے۔ میں نم سے کہہ چکی ہوں کہ بیوی نور کے جب تک میاں نوکر جا کر رہے اکثر ان سے ناخوش رہیں اور ان کے ان ڈھنگوں کو کبھی انہوں نے پسند نہ کیا مگر میاں کا اندھا ہوتا تھا کہ وہ پاؤں کی خاک ہو گئیں۔ کیا کوئی لوندی یا ماما خدا کرے گی جو انہوں نے کی۔ بیوی کی یہ اطاعت دیکھ کر میاں کا کلیجہ منڈکوتا۔

سلام پھیر دوا پیسے بیٹھ جاتیں اور مہیاں نے آنکھ کھولی اور انہوں نے کلی کو پانی دیا اور دوائی پلائی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ اپنے ہاتھ سے دھوپ میں لیجا کر بٹھاتیں اور اپنے ہاتھ سے اندر لے کر آتیں۔ اس اطاعت نے میاں کے دل میں ایسا گھر کیا کہ وہ ان کے پاؤں چومے اور کہتے کہ جنت کی عوریں بھی نعم سے بہتر نہ ہوں گی ایک روز کا ذکر ہے مسجد کی نماز پڑھ کر انھیں کہ میاں نے کروٹ لی۔ کہنے لگیں

”کیا جاگ رہے ہو کچھ کام ہے؟“

میاں ”کیا خاک جاگ رہا ہوں تقدیر کو رر رہا ہوں۔ تھوڑا سا پانی پلا دو۔“
بیوی ”کیوں رونے کی کیا بات ہے خدا کا شکر کرو کہ عزت آبرو سے گھریں بیٹھے ہیں۔ لو پانی پیو۔“

میاں ”میری حالت اب یہ ہو گئی ہے۔ کہ تم سے کوئی کام لیتے ہوئے بھی مجھے خسر م آتی ہے، دن رات اسی فکر میں رہتا ہوں کہ کیا کروں۔ ایک پیسہ کی آمدنی نہ رہی۔ خدا باش ہے تم کو اس طرح گزارہ کر رہی ہو۔“

بیوی ”تم کس قسم کی باتیں کیا کرتے ہو۔ تمہیں خسر م کس بات کی؟ میں ہوں کس واسطے؟ جو کچھ کر رہی ہوں یہ میرا فرض ہے۔ روپے کی طرف سے تم زیادہ فکر نہ کرو۔ میں ہمیشہ یہ کیا کرتی تھی کہ جو روپہ تم میرے ہاتھ میں دیتے تھے فی روپہ ایک آنہ اگ کر دیتی تھی ایک پیسہ اکثر کے نام اور تین پیسے محفوظ جب وہ پیسے روپہ ہو جاتے تھے تو پیسے دیکر روپے بن جاتے تھے اور ڈال دیتی تھی۔ اب جو میں نے دیکھا تو خدا نے یہ برکت دی کہ سات سو روپے ہو گئے ایسی واسے سیٹھ کی بیوی پرسوں کہہ رہی تھیں کہ تم وہ روپہ دیدو میں بیچ میں ڈال دیتی ہوں میں روپے ہینہ کے ہینہ لئے جانا اب اگر تمہارا زنت ہو تو دیدوں انہیں تو یہ روپے حاضر ہیں جو تمہاری صلاح ہو وہ کروں۔“

اں ”میرا تو منہ نہیں جو تمہاری تعریف کروں خدا تم جیسی بیویاں دنیا کو بے

بہت سی دالا سیٹھ نہایت ایمان دار آدمی ہے۔ تم فوراً رو پیہ دیدو۔ بلا سے ہم کو تو یہ بیس روپے بیس اٹھرقیاں ہو جائیں گی۔“

پیاری بچیو! یہ بیوی نور کا سلیقہ تھا کہ اسی بیس روپے میں انہوں نے گھر کا خرچ بھی چلایا۔ ایک بیٹی تھی بیاہی اور دنیا کے سب کام کاج کئے لاکھ روپے کی بات جو انہوں نے کی وہ یہ تھی کہ اس مفلسی میں گھر کی ہوائ نہ بگڑنے دی

سٹوٹھوان باب

کچھ وقت کا مطالبہ تھا کچھ پہاڑ کی آب و ہوا کا اثر ازاہدہ کا شوہر چراغ باہن تو ہو ہی چلا تھا۔ اب صحبت بھی ان لوگوں کی ملی جو دن رات فیشن کا کلہ پڑھ رہے تھے۔ آمدنی معقول تھی آنکھیں کچھ اور ڈھونڈنے لگیں۔ گھر گھر کی حالت۔ درمی۔ چاندنی۔ برتن بھانڈا۔ سب چیزیں زہر تھیں عدیہ ہے کہ گھر کے ساتھ گھروالی بھی آنکھوں کو ناگوار ہوئی اور جی چاہا کہ گھر بدلے اور ساتھ ہی گھروالی کی بھی تبدیلی ہو، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو تعلیم یافتہ بیاہیں میسر آتی ہیں اور جو جانتی ہیں کہ زندگی کس طرح بسر کریں۔ ان کی ہر ادا ان کی ہر کوشش۔ ان کا ہر فعل ان کا ہر قول طبیعت کو خوش اور دل کو چو نہال داغ کو تازہ اور شوہر کو باغ باغ کر دیتا ہے کاش میری تقدیر میں بھی ایسی بیوی ہوتی اور میں بھی دنیا کا کوئی لطف اٹھا سکتا۔ آخر اسی بیوی کی بہن شاہدہ ہے میں نے صرف جو تھی ولے روز دیکھا تھا۔ صورت شکل۔ بات چیت کپڑا لٹہ گھنا پاتا۔ بیچ تو یہ ہے کہ علم کی خوشبو اس کے ہر ذرہ سے جھک رہی تھی۔ کیا خوش نصیب ہے اس کا شوہر جس کو ایسی بیوی ملی ایک میں ہوں کہ سوا دقیا نویسی خیالات اور جہالت کی گفتگو کے کوئی آواز ہی کان میں نہیں آتی مگر مجھے فکر کس بات کا۔ روٹی کپڑا دے جاؤں گا اور چین سے دوسرا بھل کر کوچا کیا وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہو کر ایک جاہل عورت کے ساتھ اپنی زندگی برباد کروں۔ مجھ کو

خدا کی اجازت خدا کے رسول کی اجازت اشد ضرورت، پھر نہ کرنے کا سبب؟
 (دیکھو) کیا کمی احسان کے اس خیال کا زبان تک آتا تھا کہ خود ہی لڑکیوں
 کے درختا ہٹتی ہو گئے اب یہ میاں کی عنایت سمجھو انسانیت کہو انصاف سے
 تعبیر کرو جو چاہے کہو کہ انہوں نے بیوی کو بھی اطلاع دیدی اور اس طرح کہا۔
 ”تم کو معلوم ہے کہ شرع اسلام نے مرد کو چار نکاحوں کی اجازت دی ہے
 میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میری زندگی بالکل برباد ہو رہی ہے اور کوئی وجہ نہیں
 معلوم ہوتی کہ اس طرح یہ زندگی غارت ہو۔ مجبوراً میں نے کوشش کی ہے کہ ایک
 تعلیم یافتہ عورت سے عقد کروں اور اس طرح کمی کو پورا کر لوں۔ مگر میں تم کو یقین دلاتا
 ہوں کہ تمہارے شرعی حقوق نہ بھولوں گا“

ترجمہ: بیشک تم کو شرع نے اجازت دی ہے اور مجھ کو اس میں دخل دینے
 کا حق نہیں مگر میں اپنی محبت سے مجبور ہوں اس کو آسانی سے برداشت نہ کر سکوں گی تم
 شوق سے نکاح کرو مگر میری رائے میں یہ مناسب ہو گا کہ تم مجھ کو چند روز کے واسطے
 گھر پہنچا دو۔

احسان: ”نہیں یہ مناسب نہیں ہے رفتہ رفتہ سب باتیں گوارا ہو جائیں گی
 یہ خاطر جمع رکھو کہ تمہارے اعزاز و اکرام میں کسی قسم کا فرق نہ آئیگا“

ترجمہ: ”یہ تو مجھے تمہاری عنایت سے اُمید ہے اور میں جانتی ہوں کہ تم پر وہیں
 میں بے وقتی نہ ہونے دوں گے۔ لیکن اس وقت تو اگر تم مجھ کو پہنچا دو تو اچھا ہے“

احسان: ”بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں اس کو پسند نہیں کرتا“

ترجمہ: ”اگر تمہاری رائے میں میرا یہاں کا قیام ضروری ہے تو خیر“
 احسان شادی کی دھن میں مست تھا اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ نئی بیوی کے
 سامنے پرانی کو دور کر دے مگر ایک جھجک تھی کہ عزیز اقارب سنا کر گڑنا جائیں۔ اس وجہ سے

اس نے بیوی کا جانا مصلحت نہ سمجھا اور یہ ہی مناسب سمجھا کہ اس کو یہیں قید کرے شادی میں کیا ہاتھی گھوڑے لگتے تھے۔ جگہ تجویز ہوئی۔ تاریخ ٹھہری۔ نکاح ہوا اور نئی دہلی گھر میں آدھمکی ۛ

یوں تو اس واقعہ کا ہر ٹکڑا کھلا ہوا ظلم تھا۔ مگر وہ ظلم جس کی تلافی ناممکن تھی یہ ہوا کہ احسان نے بیوی کا تمام زیور نئی دہلی کو چڑھا دیا۔ اندیشہ تھا کہ شاید میاں کی یہ حرکت زاہدہ کو پسند نہ ہو مگر نیک کوک کی بیٹی تھی انکار کیسا ادھامل کس کا ہنسی خوشی آگئے رکھ دیا۔

نئی دہلی کی محبت اور دہلی میں مغربی طرز کی تعلیم یافتہ جس کے میاں احسان جویا اور آنکھیں تملاشی، جس قدر بھی ہوتی کم تھی۔ قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتا اس کی زبان سے کسی بات کے نکلنے کی دیر تھی تبدیل میں دیر نہ تھی۔ اب زاہدہ کی حیثیت صرف ایک ماما کی تھی آٹھ آٹھ دن سر میں تیل ڈالنا لگتا تھا۔ البتہ نہانے کی عادت چونکہ بچان کی تھی۔ اس لئے نہ تو روز لیتی تھی۔ نہ کراٹھی اور وہی میلے کپڑے پہن لے۔ احسان بیس روپیہ ماہوار بھی خرچ کرتا تو زاہدہ جیسی ماما اس کو میسر نہ آتی۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ لڑکا تھا بچہ نہ تھا۔ اگر جھوٹ موٹ بھی زاہدہ سے بات کرتا ہوں تو نئی دہلی سچ مچ مجھ سے بات نہ کریگی۔ مہینہ مہینہ بھرا کھانکھا کر نہ دیکھنا کھانا جو نئی دہلی نکال کر دیتی۔ اور کپڑا جو وہ اپنے ہاتھ سے بنا دیتی۔ سر آنکھوں پر رکھتی۔ چھ مہینے اسی طرح بسر ہوئے اور اب سردی زور سے چلنے لگی ۛ

صبح کے وقت ایک روز احسان اچھا بچھا تھا۔ ہاتھ منہ دھو مدرسہ گیا مگر چار بجے کے بجائے ایک ہی بجے آگیا اور آیا اس طرح کہ بخار میں وہ تھا۔ شام کو خفیف سی سینہ میں کک معلوم ہوئی۔

دوسرے روز ڈاکٹر کو بلایا اس نے نمونیا تجویز کیا۔ صبح کو حالت خراب اور

شام کو بدتر اور چوتھے روز تو اتنی خراب تھی کہ بات تک ٹھیک نہ کر سکتا تھا۔ رات کو پھر ڈاکٹر آیا تو اُس نے کہا ”طاعون کا بخار معلوم ہوتا ہے۔“ اب مغرب زدہ تعلیم یافتہ بی بی کا کیا کام تھا۔ مرض متعدی میں ٹھہر کر خود مرض میں کیوں گرفتار ہوئیں اسی وقت برقع اوڑھ سیدھی ہوئیں۔

زاہدہ بچاری جاہل ٹھوٹا، وہ مرض متعدی کو کیا سمجھتی۔ رات رات بھر یہاں کی پانٹنی نہ چھوڑی :

ایک رات کا ذکر ہے کہ احسان بے خبر پڑا تھا پچھلا پہر تھا اور پردہ زین کی خاشاکی گھر کے کونے سے ٹپک رہی تھی۔ تارے جھللا جھللا کر بے ثباتی دنیا کے نعرے لگا رہے تھے۔ چاندنی بھیک پیڑ چکی تھی کہ زاہدہ کے تنہیل نے اس کو ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیا اس کو شوہر کی موت کا یقین ہو گیا اور وہ سوچنے لگی کہ دنیا کی تمام خوشی زندگی کا مدار اس دم سے تھا اس کی جھڑکی غیر کی عنایت سے اور اس کا غصہ دوسرے کے پیار سے بہتر، جب یہ نہیں تو کچھ نہیں میری جنت ان قدموں میں اور میری دنیا اس صورت میں پوشیدہ ہے۔ میں بد نصیب تھی کہ جس کی خوشی پر راحت اور مغفرت کا انحصار تھا اس کو خوش نہ رکھ سکی۔ بعض دفعہ کیسی کیسی سخت باتیں اور کتنے کتنے ٹیڑھے جواب دیتی تھی۔ مگر خدا عمر دراز کرے سن کر چپ ہو جاتے تھے اب یہ کہاں اور میں کہاں۔ میری زندگی برباد اور میری عاقبت تاراج ہوئی۔ میں نے کیا غضب کیا کہ قصور بھی تو معاف نہ کروالیا۔ اب دُکھنہ سے بات بھی نہیں کی۔ دو اکبوتر پلاؤں میں بیچ چکے۔ آنکھ ہی نہیں کھولی۔ مائے یہ سانس کیسا چل رہا ہے۔

زاہدہ گھبرا کر اٹھی آنکھ سے زار قطار آنسو کی لڑیاں جاری تھیں منہ دیکھا اور میا ختہ یہ کہہ کر پاؤں میں گر پڑی :

”مجھ کو نڈی کا قصور معاف کرو“

آنکھیں لمبوں سے مل رہی تھی احسان کی آنکھ کھلی۔ بیوی کی محبت برہمی کی طرح کلیجے میں گھسی اور ساتھ ہی نئی دہن کے چلے جانے کے خیال نے تمام حوصلے پست کر دیے زاہدہ کا اضطراب بجلی بن کر کلیجہ پر گر اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور کہا۔

”مجھ سے غلطی ہوئی۔ اگر زندہ رہا تو عمر بھر پاؤں دھو دھو کر پیوں گا۔“

ابھی احسان کا شکریہ ختم نہ ہوا تھا کہ موزن کی صدائے توحید نے رات کی خاموشی کا سلسلہ توڑا۔ اٹھی وضو کیا۔ نماز پڑھی اور شوہر کی صحت کے واسطے گڑگڑا کر خدائے واحد کے حضور میں روتی۔ وقت نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ نماز کی دعا قبول ہوئی۔ مختصر یہ کہ دولہے نے انز کیا اور احسان کی حالت روز بروز سنبھلنے لگی۔

ٹوٹا باسن کبیرے کے سر، جب تک احسان بیمار رہا زاہدہ کی ملکیت تھا۔ مگر تندرست ہونا تھا کہ نئی دہن معاپنے تمام حقوق کے گھر میں آتیں۔ زبردست کے بسوے بیس زاہدہ پھر وہی ماما تھی اور نئی دہن گھر والی۔ احسان اگر ذرہ بھر عقل سے کام لیتا اور غور کرتا تو واقعات آنکھ کے روبرو تھے۔ مگر بد بخت ٹھوکر کھا کر بھی نہ سنبھلا، اب نئی دہن کو زاہدہ کی زندگی ایک کاٹا تھا جو ہر وقت دل میں کھٹک رہا تھا لاکھ وہ دب چکی تھی اور اگر گھر سے اب اس کو واسطہ تھا تو صرف چوڑے سے مگر جائز کی دوہلا ہر وقت اور ہر موقع پر نئی ٹیلی ایک نہ ایک بات ایسی جڑی تھی کہ احسان آگ بگولا ہو جاتا اور منہ میں جو آتا سنا جاتا۔

ایک روز شام کے وقت احسان نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی۔ زہدہ نے ہنسی ہنسی اور خوشی خوشی کھانا تیار کر دہن کے آگے لاکر رکھ دیا اور کوہ میں بیٹھ گئی؛

دہن۔ ”بس باورچی خانہ میں جاؤ میرے سر پر کیوں چڑھ کر میٹھ گئیں“

زاہدہ۔ ”ہاں بیوی چلی جاتی ہوں اس لئے بیٹھ گئی تھی کہ شاید بزن وغیرہ کی

ضرورت ہو تو دیدوں“

دلہن ”نہیں جس وقت ضرورت ہوگی میں خود بلا لوں گی۔“

یوں تو دن رات ہی زاہدہ کے دل پر ایک سے ایک زبردست چرکا لگتا تھا۔ مگر اس وقت کا کچھ کا ایسا بیٹھا کہ آنکھ میں آنسو آگئے۔ دس بارہ آدمیوں کا کھانا ایک ایک پیچانے والی۔ دو بجے کی چوٹے میں گھسی گھسی مغرب کے وقت نکلی اور یہ انعام ملا۔ غلجہ جاکر رونے لگی کہ احسان آیا اور کتنا کھانا باہر کون دے گا۔“

دلہن ”لاؤ میں یہاں سے دیدوں گی تم وہاں سے لے لینا۔“

احسان ”واہ تم کیوں دینے لگیں زاہدہ کہاں ہے؟ بتاؤ۔ جواب نہیں دیتیں۔“

دلہن ”کیا بتاؤں وہ تو ہمیشہ ناخوش رہتی ہیں۔ میرا جو کام تھا۔ میں نے کر لیا۔ کیا حرج ہے میں ادھر سے دیدوں گی تم ادھر سے لیلو۔“

احسان ”زاہدہ! زاہدہ!“

زاہدہ ”جی“

احسان ”کیا مصیبت ڈھارکھی ہے ہر وقت گدھے پر سوار“

زاہدہ نے احسان سے چھپانے کے واسطے دوپٹہ سے آنسو منہ پھیر کر پونچھے اور کہا آپ جو فرمائیں حاضر ہوں۔“

احسان ”یہ کھانا ادھر سے کھڑے ہو کر دیدو“

زاہدہ ”اچھا“

نئی دلہن نے کھانا نکالا۔ زاہدہ نے اٹھا اٹھا کر باہر دیا۔ مگر نہ معلوم کیا نہ کھانے میں تھا کہ ایک ایک نوالہ کھا کر سب نے ہاتھ سکیڑ لیا۔ چادلوں میں نمک زہر سالن میں مرچیں ہلاہل۔ اور تو اور غضب یہ کہ فیرنی میں برابر کی خاک اور کھانوں میں برابر کی راکھ۔ احسان کے ہوش جاتے رہے۔ دعوت عداوت اور ضیافت مصیبت ہو گئی۔

بازار سے جو کچھ میسر ہوا لاوا ان کے پیٹ بھر چلنا کیا۔ اور آپ آگ بگولا گھر میں آسانی داستانِ دلہن کو سنائی۔

دلہن۔ میں تو اسی واسطے سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں کہ اپنا کام جہاں کام۔ اُس ان گجراتی کنگنوں میں یہ مار ہے کہ مرچیں اندر بیٹھ جاتی ہیں اس لئے مصاکح ان سے پسوایا تھا کیا خبر تھی کہ یہ آفت ڈھائے گی۔ ورنہ میں تو ان کو باور چچانہ میں قدم بھی نہ دھرنے دیتی۔

احسان۔ ”یہ تو صورت دیکھ دیکھ کر جلی جاتی ہے شریف تھوڑی ہے جو شرافت کے برتاؤ کو سمجھے میں اس کج نیت کو غارت کر دیتا ہوں اور اس کے منہ ہی کو آگ لگاتا ہوں۔“

بد نصیب بیوی کی کیا مجال تھی کہ سفاک شوہر کے حکم میں دم مار سکتی جب تک جاگتا رہے صلواتیں سناتا رہا۔ کنبہ بھر کو اگلا۔ سات پشتوں کو پٹا۔ جوجی میں آئی وہ سنائی۔ اور جو منہ میں آیا وہ بنایا۔ صبح اٹھا تو حکم دیا کہ آج تو غارت ہوگی اپنا اسباب و سبب باندھ لے۔

زادہ آدمیوں کا پورا ذخیرہ شوہر کے پاس چھوڑ حشر نوں کا ذوق اسباب ساتھ بے پہاڑ سے چلی۔ گھر کو گھر کے کونہ کو آخری نظر سے دیکھا۔ محلہ اور محلہ کا بچہ بچہ اس کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر رہا تھا، رائی میں اس کی بلایاں لیتی تھیں اور تھیم اس کے قدموں میں لڑتے تھے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے وقت ایک التجا بھری نظر شوہر کی صورت پر ڈالی اور کہا۔

”خدا کے واسطے میرے قصور معاف کر دینا“

اگر ایمان پاس ہوتا، اگر عقل ساتھ دیتی تو مظلوم بیوی کی یہ التجا ظالم کا کلیجہ توڑ دیتی مگر دل سے نہیں دکھاوے کو نہیں۔ فقط شوق پورا کرنے کو ہاتھ بڑھا کر

مصافحہ کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ بد نصیب بخاریں بھلس رہی ہے! پوچھا کیا حال ہے؟

زاہدہ۔ "خدا کا شکر ہے۔"

احسان۔ "رونے کا سبب"

زاہدہ۔ "کچھ نہیں۔ ایک بات عرض کرتی ہوں۔"

احسان۔ "کیا ہے؟"

زاہدہ۔ "تمہاری تنخواہوں میں سے کچھ روپے میرے پاس بچے ہیں یہ لے لو خدا نصیب کرے۔"

دو سو روپے کی ایک پوٹلی زاہدہ نے شوہر کے ہاتھ میں دی اور رو کر کہا۔

"میری خطائیں معاف کر دینا"

احسان۔ "اچھا۔"

زاہدہ۔ "خدا حافظ"

زاہدہ کی گاڑی مشکل سے سو گز گئی ہوگی کہ احسان ہانپتا کانپتا دوڑ آیا اور دوسری گاڑی بان کو آواز دی کہ روکو۔ گاڑی رُک گئی احسان کا چہرہ غصہ سے سُرخ تھا وہ بُرا بھلا کہتا ہوا اندر گھسا اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور کہا۔

"کبجنت چور! روپیہ دیکر شاہ بنی اور سارا زیور اڑا لائی"

احسان کا غصہ اس قدر تیز تھا اور اس قدر چلا رہا تھا کہ اس کی حالت دیکھ کر لوگ سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ اسباب نکال نکال کر باہر پھینکنا شروع کیا اور زبان وہ الفاظ استعمال کئے۔ جن کو سن کر خلقت بھی دنگ رہ گئی۔ زاہدہ بخاریں تو تھم میار کی صورت تک رہی تھی کہ احسان نے کہا "بتا کبجنت نامہ از پور کہاں چرا کر رکھا۔"

زاہدہ۔ "مجھے معلوم نہیں میں تو دلہن کے کمرہ میں گھسی بھی نہیں۔"

احسان۔ "پکی چور ہے کیوں قبول نہ لگی! اس کبس کی کنیاں دے؟"

بخار کا نور چوری کا الزام، خلقت کا ازدہام بد نصیب کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی دقت کی بات ہے کنبیاں نہ ملیں۔ احسان کو تاب کہاں تھی اتنا کہہ کر کہہاں چوری کھلتی ہے کنبیاں تو آپ ہی سے کھوئی جائیں گی۔ پتھر سے فضل توڑا زور کی پوٹلی موجود تھی نکال کر اس زور سے منہ پر ماری کہ چکرا گئی۔ گاڑی کو لوٹا کر گھر لے گیا۔ نئی دہلن دروازہ میں کھڑی تھیں دیکھتے ہی گھبرا کر پوچھا۔ ”کیوں ملا؟“

احسان۔ ہاں نہ کیوں ملتا۔

اسباب اترا۔ زاہدہ اند آئی۔ چوری کے غل غپاڑے سے محاذ کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں زاہدہ خاموش گم سم کھڑی تھی اور کہتی تھی ”زمین شق ہو جائے اور میں سا جاؤں“ کہ دہلن نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے میں نے ابھی دیکھ لیا ورنہ وہ تو میرے اوپر تھوپ ہی چلی تھیں

احسان۔ اری بول تو سہی جل جو گنتی! چور آنکھوں کا کابل چرانے والی بھی تجھ سے زیادہ نہ ہوگی۔ کجبت“

محلہ والیاں بھی جو منہ میں آتا کہتی رہیں اور کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو زاہدہ پر لعن طعن نہ کر رہا ہو، ایک خاموش تصویر تھی ایک ساکت پتھر تھا، ایک گم سم عودت تھی جس کی آنکھ سے متواتر آنسو کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔ نگاہ اٹھتی نہ تھی بات ہونی نہ تھی۔ انتہائے ندامت تھی کہ دن رات دعائیں دینے والیاں بچتا چور کہہ رہی تھیں۔ دہلن بولی یہ تو میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ خدا معلوم کس دقت نکال کر رکھا وہ تو خدا نے خیر کی کہ تم نے روپے مانگے میں صندوق کھولنے لگی دیکھتی ہوں تو پوٹلی ندارد۔ غضب خدا کا گھر میں یہ آفت، کہو وہ کس کا تھا کمائی تو ایک ہی کی ہے تہا لالہ مال کس کا اور میرا کس کا“

نئی دہلی کو شمش میں تو عرصہ سے تھی کہ کسی طرح ایسا ذلیل اور ایسا رسوا
 کھول کہ احسان اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا کیسا اس کا نام تک نہ لے مگر موقع کا
 انتظار تھا اب جزا بدہ نے اسباب باندھنا شروع کیا تو چپکے سے کس میں زیور رکھ
 خاموش آبیٹی اور جب گاڑی روانہ ہو گئی تو میاں سے کہنا کہ ”زیور لے گئیں“ چوری
 پوری اور مال سامنے تھا۔ اس وقت تک احسان کی بدولت جعفر مصیبتیں آئیں زیادہ
 نے ان کو راحت سمجھا۔ سوکن کے کانٹے پھول کی طرح گود میں لئے اور ناگ سے کھلونے
 کی طرح کھیلی۔ مگر اس صدمہ نے جان پر بنا دی۔ عورتیں صحن میں کچھا کچھ بھری تھیں۔
 نئی دہلی نے ستم یہ کیا کہ اسی وقت اپنے رشتہ داروں کو بھی تماشہ دیکھنے کے لئے بلایا۔
 ہر طرف سے لعنت اور ہر کوئی سے ملامت کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ شام کے وقت
 احسان نے باہر میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا کہ یہیں کی تجویز کی اور کہا ”تجہ
 چور مکار کی سزا تو یہ تھی کہ عمر بھر جیل خانہ میں سٹر سٹر کر مرنی مگر ہم شریف ہیں کہ اپنی
 شہریت سے کام لیکر تجہ پر رحم کرتے ہیں“

اب البتہ ایک جوش زیادہ کے سینہ میں اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا
 چھا گیا اس کی آواز غصہ سے بھر اگئی اس نے سوکن کی طرف دیکھا اور کہا ”انسانی آنکھ
 سے پوشیدہ رہنے والا ہر معاملہ قدرت کی اس زبردست آنکھ کے سامنے سے چوہاڑ
 کی ڈراڑ میں چوٹی کے ریگنے کی اور کھوکھلے تنے میں کیڑے کی حرکت کو دیکھتی ہے۔
 شہادت صرف چشم ظاہری پر ختم نہیں۔ جن مخلوقوں کا کوئی نہیں ان کی بے گناہی کا گواہ
 صرف وہ قدرت والا ہے جو اس فانی جسم کو ایک روز خاک کرے اور جانتا ہے جس نے
 زیور کی پوٹی اس کس میں رکھی۔ میں نے اگر اس پر دیں میں اپنے خاندان کی آبرو اور اپنے
 باپ دادا کی لائے چوری کا الزام لگا کر زندوں کو بدنام کیا اور مردوں کو اذیت دی تو اس
 کا بہتر فیصلہ کرنے والا وہی حکم الحاکمین ہے۔ دنیا کی کسی حالت کو ثبات اور زندگی کی

کسی کیفیت کو قیام نہیں اطمینان عارضی اور خوشی چند روزہ جہاں ہے جس طرح موت زندگی کی تاک لگائے بیٹھی ہے اسی طرح بے اطمینانی اطمینان کے شکار میں مصروف ہے دہن بیگم جس وقت نے مجھ سے وفانہ کی یہ تم سے بھی نہ کرے گا۔ یہ انسانی ہستی جو شوہر کی حیثیت میں میرے سامنے کھڑی ہے اس کی بدولت میں نے بھی اس دنیا میں راج کئے مگر آج جب میرا تخت چھن گیا اور میں سلطنت کھو کر تمہاری دست نگر ہوں تو صرف یہ خیال مجھے تقویت دے رہا ہے کہ سہاگ کے زعم میں نا اتفاقی کی آگ کو فراموش نہ کیا کوئی بات ایسی نہ کہی اور کوئی کام ایسا نہ کیا جو دوسروں کے واسطے کلفت اور اذیت ہو میں نے تمہارے ساتھ اگر آج تک کوئی بُرائی کی ہو کوئی ایذا پہنچائی ہو تو تم مجھے بتا دو۔ میں نے کڑوے گھونٹ شہد کی طرح پیئے اور زہر کا پیالہ امرت سمجھا اس سزا کی سزا دار نہ تھی کہ میری عزت اس بھرے مجمع میں اس طرح برباد ہو اور میری چوری کا غلط ڈھنڈورہ پردیس کی سڑکوں پر پڑے۔ خیر خدا کی مرضی اور شوہر کی رائے سر آنکھوں پر جو ہو گیا۔ خوب ہوا اور جو ہوگا اچھا ہوگا لیکن وقت آئیگا کہ شاید حقیقی کی صدا واقعات سے تاریکی کا پردہ اٹھا دے گی اور دنیا دیکھے گی کہ زاہدہ بے گناہ تھی۔

ایک بندھی ہوئی تھی اور وہی درو دیوار جو لعنت برسا رہے تھے زاہدہ کی صدا کا نعرہ لگانے لگے احسان خاموش اور دہن ششدر تھی کہ زاہدہ آگے بڑھی اور شوہر سے کہا ”چلو جس جگہ پہنچا نا ہے خود پہنچا دو موزن اذان دے رہا ہے نماز قضا نہ ہو“ ایک ایسی رفتار سے جس میں سرتاپا ندامت شامل تھی احسان چلا اور زاہدہ کو دوسرے گھر میں لے جا کر بٹھا دیا۔

ستر ہواں باب

”وقت نے تم کو اتنا بڑا جھکولادیا اور وہ مصیبت ڈالی کہ اگر پتھر بھی ہوتا تو موم بن کر خدا

کے حضور میں گر پڑتا اور مان لیتا کہ قدامت کے کیسے کیسے جوہر تم نے خاک میں ملا دے۔

جن کو تم جاہل اور پھوٹہ رکھ رہی ہو وہ درحقیقت ایسی تھیں کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھتے۔ مگر افسوس تمہاری عقل پر اور تعجب تمہارے قیاس پر کہ اپنی آبرو گنوا کر بھی تمہاری عقل درست نہ ہوئی!

شاہدہ۔ آپ ہر وقت مجھ کو اسی ایک بات کا طعنہ نہ دیا کیجئے۔ اس کو اس کیسا واسطہ میں جو بات کہہ رہی ہوں اس کا جواب دیجئے۔ یہ جو آئے دن کجخت فقیر تھے کٹے موٹے تازے محل کھلاتے رہتے ہیں کہیں کوئی صوفی بن کر زیور لے اڑے، کہیں کوئی حن بن کر گھرموس لے لگیں، یہ سب قدامت کے کرشمے نہیں تو کیا ہیں؟ آپ ہی کا بیان ہے، بارہا آپ نے کہا، آپ کی والدہ صاحبہ نے فرمایا۔ کہ آپ کی چچی جان کو ایک بڑھیا نے پیرانی بن کر ایسا دبوچا اور اتنا صفایا کیا کہ دانت کریدنے کا تنکا تک نہ رہا اگر وہ پڑھی لکھی ہوتیں، ان بد معاشوں کے واقعات ان کے کانوں سے نکل چکے ہوتے، ان کشتیوں کی چالاکیاں وہ اخباروں اور کتابوں میں پڑھ چکی ہوتیں، تو کیوں اس کے چمکے میں آتیں؟ شوہر کے گاڑھے سینے کی کمائی بچوں کا محنت سے پیدا کیا ہوا پیسہ اس طرح برباد نہ ہوتا۔ اہاں جان آپ نے ان کی حالت پر تو ہمیشہ افسوس کیا مگر یہ بھی خیال فرمایا کہ آپ کے چچا جان پر کیا گزری ہوگی جن کی جمع جتنی ایک جاہل عورت کی بدولت کٹنی کی تدر ہو گئی۔

مان۔ تم ایک بات کو دوسری بات میں نہ ملایا کرو۔ میں نے ہمیشہ تمہارے سامنے اقرار کیا ہے کہ اگلی بیویاں باوجود ان تمام خوبیوں کے جو ان کا حصہ تھیں۔ اس قدر بھولی ہوتی تھیں کہ کسی کجھوٹا سمجھنے کا وہم بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا اور اگر تم غور کرو تو ان کی یہ تربیت کچھ غلط نہ تھی۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کسی مسلمان کی طرف سے

بظن نہ ہو۔ اب اس کا ذمہ دار وقت ہے کہ کہیں ہم میں ایسے مسلمان پیدا ہونے شروع ہوئے جو اسلام سے ہزاروں کو س دور ہے اور روحانیت کو کھو کر نفسانیت میں غرق ہو گئے۔ تمہاری تعلیم کھرے اور کھوٹے کی تمیز بتاتی ہے اور میں اس کو ضروری سمجھتی ہوں لیکن ان کے یہاں کھوٹ کا وجود ہی نہ تھا اسلئے ان کو اس شناخت کی بھی ضرورت نہ تھی اب البتہ اس تعلیم کی ضرورت ہے اور اگر براہ مانو تو اس کی ذمہ دار بھی ترقی ہے اگر زمانہ اس قسم کی ترقی نہ کرتا تو ہم بھی وہی سیدھے مسلمان ہوتے۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ گنڈے تعویذوں کی طرف ان کا عقیدہ پختہ تھا اور گو میں خود ان ڈھکوسلے باز پیروں کی قابل نہیں ہوں مگر یہ ضرور کہوں گی کہ دعا کے اثر کی میں قابل ہوں۔ اور اس کا فیصلہ تم خود اس طرح کرو کہ اگر تم کو کوئی معمولی بات تمہارے مزاج کے خلاف کہہ دیتا ہے تو آگ لگ جاتی ہے اور اگر کوئی عاجزی سے گرد گرد اگر کچھ عرض کرے تو خواہ مخواہ طبیعت میں رحم پیدا ہوتا ہے اسی طرح بندہ جب خدا کے حضور میں سچے دل سے رو کر کچھ مانگتا ہے۔ تو وہ سنتا ہے اور ضرور سنتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ان بزرگان دین کی دعا شامل ہے۔ جو خدا کے پاک بندے سچے مسلمان اور نیک انسان ہیں یہ وجہ ہے کہ چچی جان گنڈے تعویذوں کی طرف جھکی ہوئی تھیں اب بھی اگر کوئی ولی کامل نظر آجائے جس کا نظر آسمان محال، تو سب سے پہلی عورت جو ان کے ہاتھ پر سمیت کرے میں ہوں۔ لیکن یہ موجودہ گنڈے اور تعویذ جن کی غرض صرف دھوکا ہے حقارت سے رد کرنیوالی بھی میں ہی ہوں تم نے ان کی اس غلطی کو تو پکڑ لیا جو غلطی نہیں بلکہ تلاش حق تھی اور ان کی نیت یقیناً قابل الزم نہیں مگر ان کی بھلائیوں پر بھی تو کبھی نظر ڈالی ہوتی وہ وہ کر گئیں کہ آج تم ابد میں مرکب بھی ہو پھر پیدا نہ کر سکیں گی جو پھر کا سنان وقت تھا اگر می زور شور سے پڑ ہی تھی نماز کے واسطے لوٹا بھر کر وضو کے لئے آ رہی تھیں کہ یہ صداکان میں آئی +

”ایک خدا کے وہ بندے ہیں جو قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ مسلمان کو جیل خانہ پہنچواتے ہو۔“

لوٹا چھوڑ کوٹھے پر گئیں جا کر دیکھتی ہیں تو آدمیوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہے ایک ضعیف العمر انسان کو جس کی ڈاڑھی سفید بگلے کا پر، عدالت کے الہکار گرفتار کے کھڑے ہیں اور ایک نو عمر انسان آنکھیں نکال نکال کر بُرا بھلا کہہ رہا ہے بڑھا خاموش تھا اس کے لب پر آہ کے سوا کچھ نہ تھا وہ تم تم تم کر ٹھنڈے سانس لیتا تھا اور آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ مجمع میں سے ایک شخص نے جو ان آدمی سے پھر دہی الفاظ دہرا کر کہا: ”یہ شخص جو آج تمہارا مقروض ہے۔ اس سے زیادہ بد نصیب آدمی دنیا میں مشکل سے ہوگا اس کے سیاہ بال علق اند کی خدمت میں سفید ہوئے ان سے سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے یتیموں اور رائیوں کو دے۔ محتاج اس کے در سے، سائل، اس کے گھر سے خالی نہ گیا۔ آج سے تین سال پہلے اس کی دولت کا ڈنکا تمام شہر میں بچ رہا تھا۔ خدا کسی کو نہ بگاڑے تم پر اس کے احسانات ہیں تم نے اسکا نمک کھایا۔ اس نے یتیم خانہ سے نکال کر تمہاری پرورش کی۔ اپنے روپے سے تم کو اس قابل کیا کہ آج تم کاروبار کر رہے ہو۔ کیا اسی دن کو کہ جب اس کا کاروبار بگڑ جائے یہ باہر کے جوان بیٹے کا جنازہ کندھے پر ڈھوئے اور عمر بھر کی رفیق بیوی کو گہری گور میں سُلا کر مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ خدا کی عبادت میں مصروف ہو تو تم جھوٹے دعوے سے روپے کا مطالبہ کرو۔ اور اس کو گرفتار کرو۔“

ضعیف العمر کی سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا اور ہنگامہ نہی کر لیتا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور نو عمر کی طرف دیکھ کر کہا: ”میں اے پیٹ سے کچھ لیکر نہ آیا تھا جو کچھ پیدا کیا اسی دنیا میں اور جو کچھ ختم کیا وہ بھی اسی دنیا میں۔ جس طرح خالی ہاتھ ماں کے پیٹ سے آیا اسی طرح،

ہاتھ قبر میں چلا جاؤں گا۔ روپہ میرے پاس بھی نہ رہا۔ اور تمہارے پاس بھی نہ رہیگا۔ مگر اس کا اثر، اس کا نتیجہ، اور اس کا طفیل میرے پاس ہے اور تمہارے پاس ہونے والا ہے۔ دنیا تماشا گاہ ہے یہاں منت نئے تماشے اور رنگ برنگ کے کھیل انسانی زندگی دکھا رہی ہے۔ جو ہاتھ اس وقت قیدی کی حیثیت سے دوسرے ہاتھ میں ہے اس میں روپے کی ریل پیل تھی۔ انٹرفیو کا ڈھیر تھا اور دولت کی چھٹا تھی۔ ہم یہ سب سوانگ دیکھ چکے اور اب مجبور و لاچار ہیں۔ میرے پاس اب کچھ نہیں میری تمام کائنات ساری ملکیت کل اثاثہ ایک بدہنی ایک تسبیح اور ایک جاننا ہے۔ یہ اگر تمہارے کام آسکے تو شوق سے لو۔ خدا کی دنیا وسیع ہے دریا کا کنارہ میری بدہنی۔ ہاتھ کی انگلیاں میری تسبیح اور جنگل کی گھاس میری جاننا ہوگی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے تم سے یا کسی سے کبھی فرض لیا ہو۔ میں نے اس پیٹ میں برائیاں بھی کھائیں اور اب سوکھی روٹیاں بھی کھاتا ہوں۔ مگر میں نے جب سے میرا کام بگڑا میری بات گئی آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ یہ ہاتھ جو اس وقت قید ہے اس کو فخر ہے کہ سوا اس خدا کے جس کے سامنے پانچ وقت اٹھتا ہے کسی کے آگے دراز نہ ہوا میں نوازی پلنگوں پر سو ہوا اور آج بان کی چار پائی مجھ کو میسر نہیں۔ خس خانوں میں رہا۔ اور اب ٹوٹی جھونپڑی بھی میری ملکیت نہیں۔ میں ایک جوان بیٹے کا باپ اور ایک مسلمان عورت کا شوہر رہا۔ مگر اب نہیں ہوں۔ میری آنکھوں نے عیش کے جلے دیکھے اطمینان کی گھڑیاں دیکھیں اور انہیں آنکھوں نے بیٹے کا مردہ دیکھا۔ بیوی کی لاش دیکھی لیکن خدا کی مرضی پر راضی اور اس کے حکم پر خوش ہوں۔ جس طرح فرحت میں شاکر رہا۔ اسی طرح مصیبت میں صابر ہوں۔ مجھ کو تمہارے دعویٰ کی خبر نہ تمہارے مطالبہ کا علم۔ تم نے اصرار کیا کہ دعوت میں شریک ہو میں انکار کرتا۔ مگر اس لئے کہ تمہاری دل نکلنی نہ ہو حاضر ہو گیا۔ تم نے میرے ساتھ دھوکہ دے کر یہ داؤں کھیلے

مجھے جل خانہ بھی عنایت ہوگا اور میں جس خدا کو یہاں یاد کر رہا ہوں وہاں بھی فراموش نہ کروں گا۔ مگر بزرگ ہوں۔ نصیحت کرتا ہوں سنو اور یاد رکھو دنیا فانی ہے یہ عمر ہمیشہ اور یہ وقت سدا رہنے والا نہیں کام وہ کر دو کہ نام نیک ہو اور جب یہ عمر ڈھل جائے اور یہ رنگ یگر جائے تو پچھتا نا نہ پڑے ۞

میں مفلس ہوں میرے پاس روپیہ پیسہ کچھ نہیں۔ جوڑے کے سوا جو بدن پر ہے اور دو سدا ہو جی کے یہاں، میرے پاس کپڑا بھی نہیں چلوے چلو۔ جہاں لے چلنا ہے اور پہنچا دو جس جگہ چاہتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپے دیکر مجھے ٹھہرانے والے قبروں میں آرام کر رہے ہیں۔ چلو بسم اللہ کرو“

خلقت کی آنکھ سے آنسو جاری تھے کہ چچی جان نیچے آئیں انہوں نے ڈیڑھ سو روپے نکالے اور چچی جان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ چچا جان کے یکسو پر بھی چوٹ لگی وہ روپے لے کر باہر آئے اور انہوں نے وہ روپیہ پیش کیا اور کہا

”میری بیوی کی طرف سے جو کوٹھے پر آپ کی تقریر سن رہی تھی۔ یہ ناچیز رستم قبول فرمائیے اور قرض میں ادا کر دیجئے“

ضعیف العمر کی آنکھ اب خشک ہو چکی تھی۔ انہوں نے روپے کے لینے سے انکار کیا اور کہا۔

”میں مرد ہوں مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی تکلیف کا بار ایک عورت پر ڈالوں“ مگر جب چچا جان نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے روپیہ لے کر اس جان کو دیدیا اور ایک چیخ مار کر یہ کہتے ہوئے گر پڑے۔

”جس دنیا میں بے گناہوں کو قید کر دینے والے مرد موجود ہیں وہاں روپیہ دے کر آزاد کر دینے والی مسلمان عورت خدا تجھ کو دین دنیا میں خوش رکھے“ ۞

بات گئی گزری ہوئی معاملہ ختم ہو گیا جو واقعہ چچی جان دکھا گئیں اب تک زندہ ہے اور گودہ لوگ نہ رہے۔ مگر دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں۔ اور سننے والے عرصہ تک موجود رہیں گے۔

تم نے ان کی ایک بات توڑ لی۔ جس میں ان کی نیت خیر تھی اور وہ بھی انہوں نے کسی لاپرواہی یا توقع پر نہیں قرض حسنہ دیا تھا۔ لیکن اس واقعہ کا خیال نہ رکھا جو ان کے دامن حیات پر سدا بہار کے پھول کی طرح کھل رہا ہے۔

اٹھارہواں باب

احسان۔ یہ آخر کیا مصیبت ہے جو آج پانچ روز سے ڈاک بٹھا رکھی ہے صبح ہے تو ختم ہے تو آخر ایسا کیا ضروری کام ہے کہ گھر میں بیٹھنے کا حکم ہی نہیں۔ کہو کیا کام ہے؟ کیوں بلا رہی ہو؟۔

زاہدہ۔ اگر فرصت ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ مجھے ایک ضروری بات دریافت کرنی ہے۔

احسان۔ مجھے مطلق فرصت نہیں ہے۔ دلہن بیگم آج تماشہ میں جانیگی گاڑی کا انتظام کرنا ہے۔ میں کھڑے ہی کھڑے تمہاری بات سن لوں گا۔ کہو کیا کہتی ہو؟

زاہدہ۔ پندرہ عشرہ ہے کچھ تندر نیاز کر دو گے؟

احسان۔ صرف اسی واسطے بلایا تھا۔ افسوس!

زاہدہ۔ ہاں بلانے کی غرض تو یہ ہی تھی۔ افسوس کس بات کا؟

احسان۔ اس لغویت اور جہالت نے تم کو یہ دن دکھایا اور ابھی تک یہ حرکتیں ختم نہ ہوئیں۔

زاہدہ۔ اس میں لغویت اور جہالت کی کیا بات ہے؟ میں دریافت کرتا

چاہتی ہوں

احسان۔ اس سے زیادہ لغویت اور کیا ہوگی! ایسی فضول رقم کس کے پاس دھری ہے کہ حاصل دین نہ دنیا، تمہاری اماں کی طرح دو من حلیم رات بھر گھوٹے اور من بھر کی کھیر پکائے۔

زاہدہ۔ میں تو صرف دریافت کرتی ہوں۔ اس میں ناخوش ہونے کی کیا بات ہے؟ اُن کا فعل اُن کے واسطے تمہارا تمہارے واسطے۔

احسان۔ خیر تمہاری رائے کیا ہے؟ محرم میں کیا ہونا چاہئے۔ کیا کوئی تغزیہ میں بھی نکالوں؟

زاہدہ۔ نہیں یہ مطلب تو میرا نہیں ہے ہاں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ پیسہ دھیلا روکھی سوکھی جانشینے دی ہو۔ شہیدوں کے نام کی نذر نیاز ہو جائے۔

احسان۔ تمہاری آنکھوں پر جہالت کے ایسے پردے پڑے کہ کسی طرح اُٹھ نہیں سکتے۔ آخر تمہارے ہی جیسی عورت دہن بیگم ہے۔ مگر ایک تعلیم نے خیالات میں ایسی شستگی پیدا کر دی ہے کہ گھر اور زندگی دونوں جنت بنے ہوئے ہیں۔ تمہارے ہی عقیدے کے موافق امام حسین علیہ السلام جو رسول اللہ کے نواسے تھے جنت میں پہنچ گئے۔ اور تمہارا یقین ہے کہ سردار ہیں جو انان بہشت کے۔ ان کی والدہ تمہاری رائے میں خاتون جنت ہیں اب تم ہی بتا دو کہ کیا وہ لوگ تمہاری اس فضول نیاز کے محتاج ہیں اور اس کا نتیجہ سوا اس کے کہ تم چند الفتوں کو کھانے کھلا دو اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان لغویات میں کیا مصلحت ہے۔ اس کی اصلی غرض صرف یہ ہے کہ مسجد کے ملانے جنہوں نے یہ ڈھکوسلے نکالے اس پہانہ سے تر مال اُڑائیں اور نذر نیاز کے مال ان کی خدمتوں میں پہنچیں۔ ایسا صفت کا روپیہ میرے پاس افسوس نہیں ہے اُن تمہارے والدین کے پاس ہے تمہاری اماں جو کچھ کریں درست ہے۔

زادہ۔ تم بھی کیسے مرنے کی باتیں کرتے ہو کیا محبت کا اظہار صرف حاجت مند کے ساتھ ہوتا ہے خوشحال کے ساتھ نہیں ہو سکتا؟ غریب پر در آوی اس کی حاجت رفع کر کے احسان کرتا ہے، اور امیر کی محبت ناچیز ندر سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ ہارون نے کیا پانی کے گھرے کی جو اعرابی لیکر آیا تھا وقعت نہ کی؟ نیت دینے والے کی دیکھی چاہتو لینے والے کی حیثیت نہیں۔ یوں تو خدا اور رسول کے نام کی بھی نیاز ہوتی ہے تو کیا خدا اور رسول ہمارے بھوکے ہیں ہم خدا کے نام پر ایک اپنا سچ کو پیہ دیتے ہیں تو کیا ہمارا یقین یہ ہے کہ نعوذ باللہ خدا ہمارے ایک پیہ کا محتاج ہے اس کی لاتعداد دولت اس کے بشمار خزانوں اس کی لازوال سلطنت میں ایک پیہ کوئی ہستی نہیں رکھتا لیکن خلوص سے دیا اور دل سے پیش کیا جائے تو وہی ایک پیہ بیڑا پار کر سکتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام بے یار و مددگار میدان کربلا میں شہید ہو کر استقلال کا سچا نمونہ اور اسلام کی بے نظیر مثال دکھا گئے وہ حضور اکرمؐ کے نواسے، خاتونِ جنت کے بخت جگر میں ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ اس واقعہ کو زندہ رکھیں اور آئیوالی نسلوں کے دل سے اس سانحہ کو فراموش نہ ہونے دیں اس یاد کو تازہ رکھنے کی صورت سب سے بہتر یہ ہی ہے کہ ہم اس روز ان پاک روحوں کے کارنامے خود پڑھیں اور دوسروں کو سنائیں۔ اس کے ساتھ ہی جو کچھ خدا نے ہم کو دیا ہے وہ ان شہیدوں کے واسطے جنہوں نے صداقت پر اپنی جانیں قربان کیں۔ خرچ کریں اور خدا سے التجا کریں کہ وہ پاک بندے جن پر تو اپنی رحمت نازل کر رہا ہے جو ہماری نذر کے محتاج نہیں ہمارا یہ حقیر مدیہ ان کی خدمت میں پہنچا دے یہ ضرور نہیں ہے کہ ہم جو دیں گے وہی ان کو پہنچے گا وہ ان دنیا کے کمرواٹ کا کیا کریں گے۔ جنہوں نے دنیا میں ان کی پیوہ نہ کی۔ وہ آخرت میں اس سے مستغنی ہیں۔ مگر ہمارا یہ فعل ان کی ہمت و صداقت کا اعتراف ہے اور سب سے بڑا راز جو اس آڑ میں ہے وہ صرف اس قدم کا اس طرح

ہم ان غریبوں کے ساتھ سلوک کر سکیں جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ اور جو دودو دانوں کو محتاج ہیں۔ میں اس مسجد کی خدمت جس کی اذان کان میں آئے فرض سمجھتی ہوں۔ لیکن ہرگز ہرگز ان موٹے خنکروں کو دینا ثواب نہیں سمجھتی جو دھڑلے سے بھیک مانگتے ہیں اور مزے کرتے ہیں۔ پردہ نشین رانڈیں ہیں، تنیم بچے ہیں، مسکین طالب علم ہیں، محتاج اپاج ہیں، میرے خیال میں اس گودہ کا ہم بھڑو حق ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم کسی طرح زکوٰۃ سے، خیرات سے، صدقات سے، ان حاجت مندوں کی اعانت کریں۔ تذر نیاز سے غرض بھی انہی حاجتمندوں کی اعانت ہے اور اس لئے میں نے تم کو تکلیف بھی دی ۛ

احسان۔ یہ فضول باتیں ایسی ضروری نہ تھیں کہ مجھ کو اس طرح تکلیف دی جاتی۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ اب میں جاتا ہوں۔

انیسواں باب^{۱۹}

”جب تک اماں جان زندہ رہیں۔ میں نے اس وقت تک آپ کو ان سے کم نہ سمجھا اور آپ کی رائے اور قیاس کی ہمیشہ وقعت کی اور اب کہ اماں جان جنت سدھاریں میری ماں آپ ہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کہنے کو نہیں واقعی آپ میری ماں ہیں۔ اس وقت کوئی بڑا بوڑھا ایسا نہیں جو ہم کو ثیب و فراز سمجھائے بیوی صاحب ہیں وہ نورہ علی نور یہ کچھ ہو چکا۔ مگر وہ صاحبیت اب تک ختم نہ ہوئی اماں جان بھی اللہ بخشے اس کی ہمیشہ شاکر رہیں۔ میری غلطی تھی کہ ابتدا میں آپ کی رائے کو مناسب نہ سمجھا اُس کا نتیجہ بھگت لیا اب آپ اس وقت تشریف لے چلے اور خود چلکر جو مناسب سمجھے وہ کہئے“

ساس۔ میاں یہ تمہاری سعادت مندی ہے اور میں ہر طرح سے

تمہاری تجویز سے متفق ہوں۔ میں توکل بھی اسی واسطے وقت پر پہنچ گئی تھی کہ تم
نا تجربہ کار ہو کسی بات میں کسر نہ رہ جائے اللہ کا شکر ہے جو اصلی کام تھا وہ اللہ نے
پورا کر دیا۔ اب جو کچھ ہے وہ دنیا کے جھگڑے اور ہوت کی جوت ہے پھولوں کی بخت کل
بھی نہیں سن آئی۔ تمہارے والد صاحب قبلہ اور تمہاری بیوی کا خیال تھا کہ پھول نضول
ہیں۔ تمہاری پھوپھی اور خالہ دونوں بیویوں کی رائے تھی کہ ہوں اور ضرور ہوں مجھ سے کسی
لے صلاح لی نہ میں نے خود غل دینا مناسب سمجھا۔

حسن۔ ”جی ہاں تو ان ہی باتوں کے طے کرنے کے واسطے تو آپ کی ضرورت
ہے اور تمام فیصلہ آپ کی رائے پر منحصر ہے۔“
حسن ساس کو لیکر گھر آیا تو عورتیں بھری تھیں اور مختلف بیویوں کی مختلف رائے
تھی۔ کوئی کہتا تھا پھول ہوں کسی کی رائے تھی نہ ہوں۔ بالآخر حسن کے والد نے دروازہ
پر آکر سمدھن سے کہا کہ پھولوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور اس رسم کا مردہ سے
کیا تعلق ہے؟

سمدھن۔ میں اس رسم کا مردہ سے کوئی تعلق نہیں سمجھتی اور یہ وہ رسمیں ہیں
جنہوں نے مسلمانوں کو تاراج و برباد کر دیا۔ اور اس کا تمام بار ان مسلمانوں کی گردن
پر ہے جنہوں نے مذہب کی آڑ میں اپنے پیٹ بھرے اور نفس کے کارن دوسروں
کی تباہی کو جائز سمجھا۔ جس دھڑلے سے، جس دریا دلی سے، اور جس اطمینان سے
یہ رسم ادا کی جاتی ہے اس کو دیکھ کر رونما آتا ہے اور جس شوق سے، جس رغبت
سے، اور جس محبت سے، اڑانے والے ان کھانوں کو اڑاتے ہیں وہ کچھ تعجب انگیز نہیں
افسوس اس کا ہے کہ وہ مسلمان جن کا کام خلوص و ہمدردی تھا۔ صداقت سے اتنے
دور ہو گئے کہ دوسرے گھروں کی آگ سے انہوں نے اتھ تاپنے جائز سمجھے۔ مائیں
جوان بیٹیوں کے لئے اور اولاد ما باپوں کے لئے سرگرمائیں مگر یہ سٹول برائی تنہا

اُڑا کر توندوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ڈکائیں اس رسم کی غرض صرف اتنی تھی کہ زندے مردے کو فراموش نہ کریں اور چونکہ صدمہ تازہ ہے لگی میں روپیہ عزیز نہ کریں خدا کی اس مخلوق کے کام آئیں جو اپنی زندگی فاقوں میں بسر کر رہی ہے اور یہ یقین کر لیں کہ جس طرح وہ محتاج بندگان خدا کے پیٹ بھر رہے ہیں۔ اسی طرح خدا ان کے عزیز پر رحم کرے گا جو اب صرف خدا ہی کی اعانت کا محتاج ہے۔ یہ محتاج واپا بج و بسکس جو واقعی محتاج ہیں وہ ہونگے جن کو سوکھی روٹیاں بھی برائی سے زیادہ اور مرغفر سے بڑھ کر ہیں نہ کہ جو گھی میں تلخی اور گوشت میں خرابی کا انبیا ز کریں :

ایسے لوگوں کو کھانا کھانا اس قدر فضول اس قدر لغویت اور اس قدر زبردستی غلطی ہے کہ خدا ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ اسی طرح مسلمانوں کا جمع کرنا بھی کچھ کم نادانی نہیں۔ شاباش ہے ان بلانے والوں پر اور صد آفریں ان آجانے والوں پر جس قوم کی اخلاقی حالت اس قدر کمزور اور ایسی قابل ملامت ہو جائے اس میں جو کچھ بھی ہو وہ خلاف توقع نہیں۔ جو عورتیں اس ماسے جس کا کریل شیر بچھڑ کر دنیا آنکھوں میں اندھیر کر گیا یہ توقع رکھتی ہیں کہ کھانے پینے کی مدارات میں کمی نہ کرے اگر ان کے مرد جو چوری دغا اور فریب کرتے ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے ؟ ضرورت تو صرف اتنی تھی کہ ایک گھر میں موت ہوئی صاحب خانہ کے عزیز اقارب اپنا اپنا کھانا لے کر اس کے پاس آئے خود بھی کھایا اس کو بھی کھلایا۔ اس کا دل بہلائیں اور اس کے صدمہ کو زائل کرنے کی کوشش کریں نہ کہ یہ ستم توڑیں جو مسلمان آج کل اس رسم کی بدولت توڑتے ہیں :

لیکن میری بحث کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ پھولوں کی رسم قطعاً اٹا دی جائے۔ میں اس کو تسلیم کرتی ہوں کہ مذہب سے اس کا واسطہ کچھ نہ ہو لیکن یہ ہمارے وہ جوہر ہیں جن کے مٹانے سے ہم خود اگر نہ مٹیں گے تو مٹنے سے بدتر ہو جائیں گے۔ ہم زندہ رہیں گے مگر اسلام ہم میں نہ ہوگا۔ میرا کہنا بظاہر تعجب انگیز ہے اور میں خود

اس رسم کی حمایت کر رہی ہوں جو ہماری بربادی کا پیش خیمہ ہے لیکن اسلام کے احکام ثابت کر رہے ہیں کہ ان کا منشا زیادہ تر یہ ہے کہ مسلمان باہمی محبت و اخوت سے زندگی بسر کریں۔ دولت سند اپنی دولت میں مست ہو کر حاجتمندوں کی تکلیف سے بے خبر نہ ہو جائیں۔ یہ ہی غرض زکوٰۃ اور خیرات کی ہے کہ امیروں کی کمائی سے غریبوں کو بھی حصہ ملے۔ پھولوں کی رسم کا حاصل بھی رکھنے والوں نے یہ ہی رکھا ہے اور یہ ہمارا یقین ہے کہ خدا کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا جب ہم بلبلار اور گزگزار اس سے انتفاع کریں گے۔ تودہ ہماری دعا سنے گا اور جو کچھ ہم اس کی راہ میں دیں گے قبول کرے گا اور دینے والے پر جو اپنے اعمال و افعال کی جزا و سزا میں مصروف ہے رحم فرما اس کو عذاب سے رمانی دے گا۔ مگر کیا میں یہ کہتی ہوں کہ پھولوں کی رسم جس طرح ادا کی جا رہی ہے اسی طرح ادا کی جائے؟ تو بے تو بہ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ قرض لیکر پھول کرنے اور حشمت سے بڑھ کر کھانا پکوانا گناہ، سخت گناہ، میری غرض صرف اتنی ہے اور جیسا کہ میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ میت کے وارث اس وقت دل کی لگی میں تو سب کچھ کر لیں گے اور بعد میں جب عدم زائل ہو گیا تو پھر کون کسی کو پوچھتا ہے اور کون کسی کو دیتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ما جس طرح زندگی میں بچہ کا کھانا پکاتی تھی اسی طرح جو کچھ خدا نے اس کو دیا ہے معمولی کھانا جو وہ روز کھاتی اور کھلاتی تھی اب بھی پکائے ختم ہر جس طرح بیوی کی موجودگی میں کھانے پینے کا انتظام اپنی حالت کے موافق کرتا تھا اب بھی کرے اور یہ معمولی کھانا ان لائندوں کو جن کی گودوں میں یتیم بچے ہیں۔ ان قیوم کو جن کا پیٹ بھرنے والا خدا کے سوائے کوئی نہیں اپنے پاس بٹھا کر اپنے ماتہ سے کھائے اگر آپ اس طرح پھولوں کی رسم انجام دیں اور یہ اہتمام کریں کہ حاجتمندوں کے سوا دوسرے کو جو واقعی حاجت مند نہیں کھانا نہ دیا جائے تو اس کو ضرور اہتمام دیجئے اور یہ رسم اس صورت میں اگر یہ حق رکھتی ہے کہ برقرار رکھی جائے افسوس

اس بات کا ہے کہ اس رسم کی جس قدر ممانعت ہو رہی ہے۔ گو وہ ممانعت کے قابل ضرور ہے۔ مگر مخالفین اس کے ساتھ ہی اس کی اصلیت کو بھی پامال کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اخوت اسلامی کے جوہر بھی زائل ہونگے اور رفتہ رفتہ اس مذموم رسم کے ساتھ ہی ہمدردی کا درخشندہ جوہر بھی خاک میں لمبا نیگا

سہمہن کی گفتگو سن کر باپ اور حسن دونوں اسی صلاح پر متفق ہوئے کہ پھولوں کی رسم اس طرح ادا کی جائے کہ کھانا گھر میں پکایا جائے اور حسن اپنے ہاتھ سے لیجا کر ان پردہ نشین رائیوں کی خدمت میں پیش کرے جن پر کڑا کے کے فاتے پر رہے ہیں۔ اور اس رسم کا خاتمہ اسی دن ختم نہ ہو بلکہ ہمیشہ چار آدمیوں کا کھانا دونوں وقت ایسے لوگوں کو دیا جائے جو واقعی حاجت مند ہیں :

سودھی اور داماد سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ما بیٹی کے کمرہ میں آئی جو آب علیحدہ مکان سے اٹھ کر ساس کے پاس آگئی تھی۔ دیکھتی ہے تو شاہدہ ایک آرام کرسی پر پڑی جھول رہی ہیں اور کمرہ میں کتے لوٹ رہے ہیں۔ چاندنی سکڑی ہوئی، درمی تھری ہوئی، کاغذ کھرسے ہوئے، کوڑا پھیلا ہوا۔ کمرہ کیا کاجھی کی دوکان ہے کہ چاروں طرف ہر قسم کا اسباب موجود ہے۔ آج بیٹی نے اتنی عنایت تو ضرور کی کہ ما کو اٹھ کر کھڑے ہو کر نہیں بیٹھے ہی بیٹھے اور لیٹے ہی لیٹے آداب یا تسلیم اور سلام نہیں مانگے پر ماتھ رکھ لیا مانے دعا دی۔ ادھر ادھر دیکھا اور کہا

”بیٹی یہ اتنی عمدتیں بھری پڑی ہیں اگر کوئی ادھر آگئی تو کیا کہے گی۔ کس رو بھی

ٹھیک نہ کیا“

شاہدہ۔ دونوں ماماؤں میں سے ایک بھی کبھی آج نہ آئی۔ حالانکہ جانتی

تھیں کہ کس قدر اشد ضرورت ہے

ماں۔ ہاں یہ بھلی تو ماقول کی ضرور ہے۔ لیکن اسی دن کو تو کہتے ہیں کہ ہم کو

تمام کاموں کی عادت ڈالتی چاہیے۔ تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک روز ماما نوکر بیمار پڑ جائے تو ماما ہی کٹ جائیں۔ یہ لوگ کچھ آج ہی پیدا نہیں ہوئے پہلے بھی نوکر جا کر ہوتے تھے اور ہم نے بھی نوکروں ہی میں آنکھ کھولی۔ مگر ہماری بڑی بڑھئیوں نے نوکروں کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ ہماری زندگی کا تمام داند مداران پر ہے اور یہ ہیں تو سب کچھ، اور نہیں ہیں تو کچھ نہیں۔ باوجود یہ سمجھنے اور ان پر بھروسہ نہ کرنے کے محبت کے تعلقات ایسے ایسے تھے کہ ماما میں مگر اور نوکر مجبور ہی ہو کر گھر سے نکلتے تھے۔ یہ نہ ہوتا تھا کہ آج کلن کی اماں روٹی پکا رہی ہے تو پرسوں مرزا کی بہن۔ روز ماماؤں کی بدلی ہوتی ہے۔ میں نے تو کسی تعلیم یافتہ لڑکی کے پاس برسوں کی ماما عام طور پر دیکھی نہیں آج یہ ہے تو کل وہ امرنیاویوں میں یہ کمال تھا کہ اس الفت اور اس محبت پر کہ ماماؤں کو اپنے عزیز کے برابر اور رشتہ دار سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ان پر بھول کر گھر کے کام کاج کو بھول جائیں۔ وہ ماماؤں کو اپنا مددگار سمجھتی تھیں کام خود کرتی تھیں اور مدد ان سے لیتی تھیں میں نے اپنی ان ہی آنکھوں سے اُن جتنی بیویوں کو دیکھا ہے جن کے بچے اشرفیوں میں کھیلتے تھے اور پیسوں کی جگہ روپیہ اٹھاتے تھے مگر میں نے تو ہمیشہ یہ دیکھا کہ ماما کے آنے سے پہلے گھر چندن کر کے رکھ دیا اپنے ماما سے جھاڑو بہا د اپنے ماما سے ٹھنڈا گرم پانی۔ ماما آئی اس نے اور کام کئے اس کے ساتھ ہی باورچیخانہ میں گھسیں اور جب تک کھانا تیار ہوا لگی بیٹھی رہیں۔ ماما میں ان کی مددگار ضرور تھیں۔ مگر وہ ماماؤں کی محتاج نہ تھیں۔ تعجب ہے کہ تمہارا دل کس طرح اس کو رُسے پر بیٹھنے کو چاہتا ہے۔ مجھ سے تو دم بھر بھی نہ بیٹھا جائے۔ اسی لئے تو بارہ مہینے ریختی رہتی ہو اُٹھنے سے تم کو وحشت، اکام سے تم کو نفرت، صحت بگڑے گی نہیں تو سوسزگی؟ لاؤ جھاڑو دو میں دوں۔ یہ غضب بھی کہیں دیکھا کہ گھر میں عورتیں آتی ہوں اور ہو کے کمرہ کا یہ ہڈا!

شہادہ۔ مجھے تو معلوم نہیں وہ کبخت کہاں جھاڑو رکھ جاتی ہے

ماں نے چاروں طرف دیکھا مگر جھاڑو نہ ملی۔ مجبور بچاری نے ایک سیلے کپڑے سے جھاڑو کا کام لیکر گھر کو ٹھیک کیا اور کہنے لگی۔

”کھو بیٹی تم نے ساس کو کیا بھیجا۔ اللہ بخشنے کیسی خوبیوں کی بری نہیں جس طرح مجھ سے کہا تھا کہ سدا بیٹی سمجھوں گی اسی طرح نباہ گئیں! ہمیشہ رہے نام اللہ کا“

شہادہ۔ تعجب ہے کہ آپ ان کی بھی تعریف کر رہی ہیں جن کو کوئی اچھا نہیں کہتا۔ مجھ کو تو انہوں نے ہمیشہ دشمن سمجھا اور دشمن رہیں۔ آپ ان کی تعریف کرتی ہیں کمال ہے میں ان کو کیا پہنچاؤں گی۔ میرا بس چلے تو جو کچھ ان کو دیاں ملے وہ بھی جھپٹ لیں

مال۔ ”موت ان ہی کو نہیں آئی۔ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا وہ گور کا منہ ضرور دیکھے گا۔ تم کو بھی اور مجھ کو بھی ایک روزینہ دانقہ چکنا ہے۔ مگر کسی کو بُرا کہنے سے پہلے یہ تو سوچو کہ آخر تم نے بھی کچھ ایسے کام کئے کہ لوگ تم کو اچھا کہیں۔ وہ تمہاری بزرگ تھیں تمہارا کرتوتوں سے جلتی اور گنوں سے بھلتی تھیں اسلئے خفا رہتی تھیں تم ان کو مرنے کے بعد بُرا

کہتی ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ مردے کو بُرا کہنا اچھا نہیں۔ اس کو بھلائی سے یاد کرو کہ

وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا ہو جائے۔ کیونکہ جو آدمیوں میں اچھا ہے وہ خدا کے ہاں بھی اچھا

ہے دنیا میں وہ تمہاری دست نگر تھیں۔ لیکن آج وہ تمہاری محتاج ہیں۔ ان کا تم پر یہ حق ضرور

ہے کہ تم جو کچھ تمہارے ہاتھ سے پاؤں سے زبان سے ہو سکے ان کی خدمت کرو۔ میں

عشا کے بعد اس وقت نہیں سوتی۔ جب تک اپنے سب عزیزوں کو تھوڑا تھوڑا سا پڑھ کر

نہ پہنچا دوں۔ ایک سورہ یوسف اور ایک سورہ بقرہ روزانہ ہوتی ہے کہ اس کا ثواب ان

مرنے والوں کو پہنچے۔ تم اس ثواب کی بھی قائل نہ ہو گی۔ مگر اس کی قلعی اس وقت کھلے گی

جب عزیز گہری گد اور جنگل بیابان میں سلاکر گھر چلے آئیں گے

میرے پیٹ کو یہ آگ لگی کہ تم جیسی بچی پیدا ہوتی جو زندوں سے کیا مردوں سے

بھی نہ ڈرے۔ کجخت ڈر خدا سے مرنے کو مرنا سمجھو اور اس وقت کی بھی کچھ تیاری کر جب یہ شعلہ شاں اور یہ دھوم دھام خاک بھی کام نہ آئے گی۔ اسی واسطے اللہ بخشنے مرنے والے اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ بچوں کی زبان سے کسی نہ کسی طرح خدا کا مقدس کلام ادا ہوتا ہے۔ ماں جان عورت ہیں مگر جس حافظ سے جی چاہے مقابلہ کر لو ذرا اسی غلطی پر فوراً ٹوک دیں گی ایک تم بھی مسلمان اور مسلمان کی اولاد ہو کہ درود شریف ہی صحیح پڑھنی نہیں آتی ہوگی۔ اللہ رحم کرے"

اکیسواں باب

ایک مصیبت تو یہ آئی ہی تھی کہ نوکری چھوٹی، اب اس پر غضب یہ ہے کہ ڈیڑھ سو روپے کا قرضہ۔ دہن بیگم میرے ساتھ چل نہیں سکتیں۔ ان کے والدین نے صاف انکار کر دیا اب میرا ایک ایک دن یہاں آفت ہے میں نے جو کیا وہ بھگنا اب اپنی غلطی پر تادم اور عقل پر روتا ہوں میں نے دوسرے نکاح کا مزہ چکھ لیا اور اس وقت اس نیک بخت نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اپنے بابا پر چھوڑ تمہارے ساتھ ایسی صورت میں پردیس جا کر کیا کروں کہ تم خود بیکار ہو۔ جب ملازمت کا سلسلہ ہو جائے تو بلا لینا چار سو روپے جمع کئے اور کھوائے اس وقت مانگے تو وہ اور ان کی بابا پر سب جان کو آگئے کہ شرم نہیں آتی یہ کیا بیچھے بیٹھے کر فائدے کرے گی"

زرا ہرہ۔ یہ تو وہ جانے اور اس کا کام۔ قرضہ جو ڈیڑھ سو کا ہے وہ تم ادا کر دو دس روپیہ مہینہ کے حساب سے جو تم مجھ کو کپڑا لے اور پان چھالیہ وغیرہ کا دیتے تھے وہ یوں کا یوں ہی رکھا ہے۔ میں نے تو کوئی بارہ تیرہ روپے اٹھائے ہیں۔ یہ روپے حاضر ہیں شوق سے لیجاؤ اور دیدو"

صبح کا بھولا اگر ختام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے احسان اگر پہلے ہی

موقعہ پر جب بیماری میں دونوں بیویوں نے تعلیم قدیم و جدید کے نمونے پیش کئے کوئی نتیجہ نکالنا چاہتا تو اسے صاف معلوم ہو جاتا کہ یہ موجودہ تعلیم نسوان جب تک مذہب کے رنگ میں نہ آئے خواتین اسلام کے جوہر پامال کرتی رہیں گی اس وقت البتہ اسکو ایک جھکولا لگا اور اس کے دل نے بے ساختہ صدا دی کہ زاہدہ پرستش کے قابل بیوی ہے کہ میرے تمام مظالم برداشت کئے اور آفت نہ کی۔ یقیناً اس نئی دولہن کی شہسوارت تھی کہ ایسی سیدھی اور بھولی بیوی کو اس طرح بدنام کیا ابھی یہ فیصلہ یک سو نہ ہوا تھا کہ بیوی نے رومال کی پوٹلی ہاتھ میں لاکر دی۔ جس میں روپے بندھے ہوئے تھے۔ منصفانہ نظریں انھیں اور ندامت کے ساتھ بیوی کے چہرے پر پڑیں تو دیکھا تو کروں پر راج کرنیوالی بیگم آج شوہر کے طفیل اس حالت میں ہے کہ کرتہ میں پیندا اور دوپٹہ میلا چکٹ !

بتیاب ہو گیا۔ آنکھ میں آنسو آ گئے باہر آیا اور جینیں مارا کر رویا۔ روچکا تو آنسو پونچھے قرضہ کارو پیہ ادا کیا۔ سوچ رہا تھا کہ کس طرح بیوی سے جا کر اپنی گزشتہ خطاؤں پر ندامت کا اظہار کروں اور معافی کا طلبگار ہوں کہ ایک لڑکے نے سامنے سے اگر خط دیا۔ کھولا تو لکھا تھا۔

ذیر احسان !

میرے اس وقت کے ساتھ نہ چل سکتے کہ تم امر مجبوری سمجھنا۔ میں جس طرح تمہاری فرمانبردار ہوں اسی طرح والدین کی مصلحت یہ ہی تھی اور ہے میں مسلمان ہوں اور حقوق اسلام کے بموجب تمہاری زندگی کی شرمکنا کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے حکم کی تعمیل نہ کرتی۔ مگر اس مصلحت کا نتیجہ نہ کہ جلد معلوم ہو جائیگا۔ جس وقت بلاؤ گے میں اسی وقت سر آنکھوں سے

حاضر ہو گئی۔ ہاں ایک بات کا انتظام کرتے جاؤ۔ میں تم کو تکلیف نہ دیتی مگر یہ مجھ سے زیادہ تمہاری عزت کا سوال ہے۔ دسمبر کے چوتھے ہفتہ میں انجمن خواتین ہند کا اجلاس ہے اور میرا نام شائع ہو چکا ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو ایسی حالت میں میرا جانا کس قدر ضروری ہے اس وقت تک تو میرا خیال یہ ہے کہ موت کے سوا کوئی طاقت مجھ کو دلاں جانے سے باز نہیں رکھ سکتی اس لئے میں سب سے پہلے تم کو اطلاع دیتی ہوں۔ کیونکہ میں اسکو نہایت ضروری خیال کرتی ہوں اور اس کے بعد ایک اور اشد ضرورت پر متوجہ کرتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ جلسہ کی شرکت کے قابل میرے پاس کوئی لباس نہیں دلاں لیڈرز روزانہ کپڑے بدلتی ہیں میں کم از کم چار روزیں دو جوڑے تو تبدیل کروں۔ زبرد تو خیر خدا کا دیا ہوتا تو اچھا تھا نہیں ہے تو اب چوری تو کرنے سے رہے۔ ہاں کپڑا تو راز و تنگ کا ہو کہ کسی کی نظر میں حقیر نہ ہوں تم کو معلوم ہے مجھ کو مصاحف وغیرہ سے نفرت ہے۔ میں ایسی جگہ ہرگز روپیہ صرف کرنا پسند نہیں کرتی جہاں روپیہ کا پیسہ بھی نہ رہے البتہ جو ضروری چیزیں ہیں ان سے مفر نہیں۔ دو جوڑے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو روپے میں تیار ہو جائیں گے۔ اگر تم ہزار کا حساب بیباق کرو تو اس رقم کے ساتھ ہی اس کا بھی فکر کر لینا۔ اور اگر اس میں وقت ہو تو میں ہرگز ہرگز تم کو اذیت دینی نہیں چاہتی تم اسی سے قرعہ کا انتظام کر لو دلاں سے بھیج دینا۔ میں تو تم کو تکلیف نہ دیتی اباجان سے کہہ دیتی وہ بنا دیتے اور میں نے یہ ہی سوچا بھی تھا اگر اب جو عور کرتی ہوں تو مجھ کو ایسی درخواست کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں طبیعت کچھ ایسی ہی لے کر آئی ہوں کہ ناجائز مطالبہ کو کبھی پسند نہیں کرتی۔ مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ اپنے اخراجات ان

اوپر ڈال دوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم کو مفصل کیفیت سناؤں۔ میں اگر معمولی لباس میں ٹھریک ہوئی اول تو خدا نخواستہ ہونے ہی کیوں لگی تو مجھ سے زیادہ تمہاری آبرو پر پانی پھر گیا۔ میں اس موقع پر خاموش بھی ہو جاتی اور ٹال دیتی۔ مگر خدا خدا کر کے تو سال بھر میں یہ موقع نصیب ہوتا ہے کہ کچھ قوم کی خدمت ہو سکے اور شاید یہی کام خدا قبول فرمائے۔ دوسرے مسلمانوں کی جو حالت ہے میں اور کی تو نہیں کہہ سکتی میری کیفیت یہ ہے کہ دیکھ دیکھ کر مٹی مٹی ہوں۔ امید ہے کہ یہ تجویزیں ضرور کارگر ہوں گی اور مسلمان عورتیں جنات کے گڑھے سے نکل کر علم کی روشنی سے منور ہوں گی ۞

تم کو اس کے انتظام میں اگر زیادہ تردد ہو تو میں ایک اور تدبیر بتاتی ہوں تمہاری مدد میں صاحب کے پاس بہت سا زور ہے جس کو وہ ہمیشہ دوسرے کی امانت بتاتی ہیں حالانکہ میں خود ان کو استعمال کرتے دیکھ چکی ہوں۔ وہ اس قدر کافی ہے کہ تم کو سال دو سال بھی نوکری نہ ملے تو پریشانی نہ ہوگی۔ اس میں سے تم ڈیڑھ سو روپے کا انتظام کر سکتے ہو۔ میں نے خود ہی یہ پرچہ تم کو لکھا ہے۔ ابھی گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا اباجان تمہارے پاس آنے کا قصد کر رہے تھے کہ رٹکی کے اخراجات کا انتظام عدالت کے ذریعہ سے کر لیں مگر میں نے ان کو روک دیا اور کہدیا کہ اب اس کا فکر نہ کیجئے میں نے ان کو منع کر دیا مگر تم جس طرح ہو اس کا انتظام آج ہی کر دو ایسا غضب نہ کرنا کہ یوں ہی چلے جاؤ۔ کیونکہ اباجان کی عادت سے تم واقف ہو دو پھر میرے روکے نہ کریں گے ۞

ایس۔ احسان

خط کے پڑتے ہی احسان کے چھکے چھوٹ گئے اور ہوش جاتے رہے۔ اٹھا ایک سرسبز شاداب قطعہ پر جہاں سبزہ کا مخی فرش چاروں طرف پھیلا ہوا تھا جا بیٹھا اور سوچنے لگا کہ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گیا میں تو سمجھا تھا کہ سکول کی تعلیم پائی ہوئی بیوی میری زندگی درست کر دے گی۔ مگر یہ کجنت تو سانپ کی چھوڑ ہو گئی۔ کچھ ایسی بڑھی لکھی بھی تو نہیں فقط لباس اور گفتگو ہی تعلیم کی دیکھ لو۔ زاہدہ کی قابلیت اس سے ہزار درجہ اور اس کی عادت و فہمت اس سے لاکھ مرتبہ افضل ہے۔ اب اس خط کا کیا جواب دوں یہ تو ایسے شورے پشت لوگ ہیں کہ اگر انکار کرتا ہوں تو نہ معلوم کس مصیبت میں ڈلوادیں گے خیر اب ایک صورت ہے کہ میں بھی چالاک سے کام لوں اور کسی طرح ان مکاروں کے پھندے سے نکل کر گھر پہنچوں۔ وہاں پہنچ کر تو میں ان کی ہوشیاری و مکاری سب دیکھ لوں گا۔ لیکن اس معاملہ میں زاہدہ کی صلاح ضروری ہے۔

یہ فیصلہ کر احسان گھر آیا تو زاہدہ کی صورت، ظاہری ایک نشتر تھا جو اس کے کلیجے میں گھسا۔ وہی بیوی جو سچ مچ کی بیگم تھی اس وقت لوندیوں کے ہڈے میں نظر کی خیال کیا تو اس تمام انقلاب کا ذمہ دار احسان اور صرف احسان تھا۔ زیادہ غور کرنے لگا تو نفس نے ملامت کی اور باز بلند کہا کہ اس تغیر پر بھی اس کے جوہر اسی آب و تاب سے چمک رہے ہیں۔ اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس وقت تک کسر نہ کی اور اینک کہ میں نے اس کو ان حالوں پہنچا دیا۔ اسی طرح میری عزت کی خواہاں اور میرے بہرم کی جویا ہے۔ آگے بڑھا اور وہ خط دکھا کر کہا

”تو اب بناؤ میں کیا کروں“

زاہدہ نے خط پڑھا اور ہانپنے لگی۔

”ان کا یہ کہنا غلط ہے یا صحیح یہ تو تم ہی فیصلہ کرو مگر اس میں کیا کلام ہے کہ اب

وہ اپنی ضرورتوں کا اظہار تم سے نہ کر سکتا تو کس سے کریں؟

احسان - ”تو کیا تم اس پر رضامند ہو کہ میں تمہارے زیور میں سے ڈیڑھ سو روپے دیدوں؟“

زاہدہ - ”میں تمہاری ضرورت کے مقابلہ اور تمہارے حکم کے سامنے ہٹاؤ کی مجال تو نہیں رکھتی۔ مگر یہ ضرور کہیں کی کہہ دوں کہ میری ملکیت نہیں اسلئے مجھے اس کے دینے کا بھی حق حاصل نہیں تمہاری ملکیت ہے۔“

احسان - ”بچہ کیا کرنا چاہیے۔ افسوس یہ ہے کہ میں دونوں جہان سے گیا۔ تمہاری تکلیف کا بار میری گردن پر سناٹ ہے اور مجھے اس کا صدمہ ہے کہ میں نے غلطی کی۔“

زاہدہ - ”میرا تو تم مطلق خیال نہ کرو میں جس طرح پہلے تمہاری لونڈی تھی۔ آج بھی ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہوں گی۔“

احسان نے دل میں کچھ فیصلہ کر لیا اور اس نے صرف اتنا کہہ باہر آیا۔
”اسبابِ ذمیرہ باندہ لو“

گاڑی کرایہ کی کا اور کہا ”مغرب کے پھر سے آنا۔ شام ہوتے ہی احسان زاہدہ سمیت گاڑی میں بیٹھ روانہ ہو گیا۔“

مغربی تعلیم یافتہ بیوی کا دھڑکا چکے سے کم نہ تھا۔ رستے بھر احسان کھٹکا رہا کہ اب کوئی آیا اور گاڑی روکی۔ صبح چار بجے کے قریب اسٹیشن پر پہنچے تو سردی خوب شدت سے تھی۔ مسافر خانہ کے کمرہ میں لیجا کر بیوی کو غم بھرا ہوا کہاں ایک لمبی تپائی پر ایک مسلمان خاتون لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں پر ایک تھکائی ہوئی لباس کی کوئی چیز لٹکائی عورتوں سے کم نہ تھی۔ ماتہ میں کتاب تھی اور نگاہ نیچے ایک عورت پر فرس بچھاے اور اپنے کچھ کولٹ سے میٹھی تھی۔ زاہدہ کا خیال تھا کہ بڑھی ہوئی عورت کی صورت دیکھ کر

اٹھ کھڑی ہو گئی۔ تپائی چونکہ سرکاری ہے کم سے کم اتنا تو کہیں گی کہ آئیے بیٹھ جائیے مگر اس کا خیال پورا ہوتا تو درکنار ان بیوی نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ زاہدہ نے دوسری طرف دیکھا تو دوسری تپائی اسباب سے رُکی ہوئی تھی۔ دوسری بیوی سے پوچھا "یہ اسباب آپکا ہے؟"

عورت - "جی نہیں ان میم صاحبہ کا ہے۔"

تعلیم یافتہ - "کیوں آپ کا کیا مطلب ہے؟"

زاہدہ - "میں بیٹھنا چاہتی ہوں"

تعلیم یافتہ - "آپ نیچے بیٹھ جائیے۔ یہ بچ آپ دیکھتی ہیں رُکی ہوئی ہے۔"

مہربانی فرما کر دھانہ کھول دیجئے کہ تازہ ہوا آتی رہے۔

اتنا کہہ کر تعلیم یافتہ بیوی نے کتاب پڑھنی شروع کی۔ کتاب تو اردو ہی کی تھی۔ مگر

الفاظ یہ تھے *

اے - کیٹ - رین

A cat ran,

دس بک از مین

This book is mine.

زاہدہ کو ناگوار تو بہت ہوا زیادہ تر اس لئے کہ اتنی انگریزی وہ بھی سمجھتی تھی۔ جلی بھی

اور مہنسی بھی۔ مگر ضبط کیا اور دھانہ کھول دیا۔

تعلیم یافتہ - "تمہیں کیا پتا؟"

عورت - "ایک ذرا ادھر کا کواڑ بیٹرد دیجئے کہ ہوا بہت تیز ہے اور میرا

بھار زدہ بچہ اچھلا پڑتا ہے۔"

تعلیم یافتہ - "میں نے آپ سے کہا کہ ایک آپ کے بچہ کی وجہ سے دوسرے

بیمار نہیں ہو سکتے آپ دیکھتی ہیں کہ تازہ ہوا کے داخل ہونے کا یہاں کوئی راستہ نہیں صرف یہ دوروشندان ہیں جو کافی نہیں ہو سکتے یہاں آدمی چار ہیں ہم کو کافی آکسیجن کی ضرورت ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کاربن ہیں رہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ اپنے بیمار بچہ کو لیکر سفر کیجئے اور دوسروں کو اذیت پہنچائیے

عورت۔ نہیں۔ بی بی میں تو تکلیف نہیں پہنچا رہی آپ دیکھ لیجئے یہ بچہ بخار میں ہلہلا رہا ہے۔ ہوا اس کے واسطے زہر ہے آپ کی اجازت نہیں ہے تو کواڑ کھلو لیجئے میں اس کو دیکھا کر ادھر منہ کر لوں گی

ناہرہ نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو بچہ بخار میں تو تھا تھا۔ اور کھانسی اس شدت کی تھی کہ نیلا ہڈا جاتا تھا

تعلیم یافتہ۔ آپ اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اس بچہ کی اس طرح کھانسی سے مجھ کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ اس کو بیمار کہتی ہیں۔ مگر اس کے کھانسنے کی آواز شیر سے کم نہیں

عورت۔ بی بی یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ کہ میں کھانسی روک لوں۔ میں مجبور ہوں

تعلیم یافتہ۔ آپ باہر جائیے دیکھئے وہ برابر کھانسی رہا ہے اور یہ بعد میں کیسی خطرناک آواز نکل رہی ہے

خانساں نے آواز دی کہ چائے حاضر ہے

تعلیم یافتہ۔ لے آؤ۔

خانساں اندر آیا۔ عورت اور زاہدہ اوٹ کر کے بیٹھ گئیں۔ اور تعلیم یافتہ نے چائے بکٹ اور انڈے کھا کر خانساں کو رخصت کیا اور عورت۔

آپ اس کو ایک انڈا اور دو سپون چائے دیجئے

عورت - "میرے پاس پیسہ مطلق نہیں" تعلیم یافتہ - "افسوس"

تراہدہ - آپ نے خانہ ماں کو اندر بلا لیا۔ حالانکہ آپ کو معلوم تھا یہاں دو پردہ کرنے والی عورتیں موجود ہیں۔ یہ مکرمہ پردہ نشین عورتوں کے واسطے مخصوص ہے۔ آپ کو کوئی حق نہ تھا کہ آپ اس کو اندر بلا تیں۔

تعلیم یافتہ - آپ بھی مسلمان ہیں۔ اور میں بھی لیکن آپ پرانی عورتوں کی طرح جاہل ہیں اور اسلام کو مطلق نہیں سمجھتیں۔ میں اسلام کو آپ سے بہتر سمجھتی ہوں پردہ جس قدر ضروری ہے اور جو اسلام کا حکم ہے اس کے خلاف کچھ نہیں ہوا۔

تراہدہ - ممکن ہے کہ آپ اسلام کو ہم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ مگر آپ کو ہمارے جذبات کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ کیا تعلیم کے یہ معنی ہیں کہ دوسروں کے جذبات کا بیدردی سے خون کر دیا جائے۔

تعلیم یافتہ - آپ نے پردہ کے اصول پر بھی کبھی توجہ کی۔ یہ آپ کا پردہ پردہ نہیں۔ اقلید ہے جو شرع اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ مذہب کو سمجھ کر زندہ رہیں ورنہ یہ زندگی فضول ہے۔ اگر آپ زیور تسلیم سے آراستہ ہوتیں اور قوم کا درد آپ کے دل میں ہوتا تو آپ کی زندگی سے مسلمان فائدہ اٹھاتے۔ جس بُری طرح مردوں نے ہمارے حقوق پامال کئے ہیں اور ہم کو انسان سے جانور بنا رکھا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہم آخر انسان ہیں۔ اور اپنی ذلت کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں

اوہ۔ اوہ۔ کیسی سخت تکلیف اس لڑکے کی کھانسی سے ہوتی ہے۔ باہر

جاؤ باہر جاؤ تم جاہل لوگ اتنا نہیں سمجھتا کہ دوسروں کو تکلیف دینے کا تم کو کیا حق ہے اگر تم باہر نہیں جاتیں تو ہم تم کو زبردستی نکال دیگا اور ابھی تمہارا رپورٹ کرتا ہے

عورت۔ بیوی ذرا باہر نکلتی تو دیکھو ہوا غضب ڈھار ہی ہے۔ اس پھول کو مار دے گی۔

تعلیم یافتہ۔ پھول پھول مت بکو۔ یہ تم کو پھول ہے ہم کو نہیں۔ انسان کا بچہ ہے، ہوتا ہے مرنا ہے۔ دوسروں کو اذیت مت دو۔ چلو۔ نہیں ہم ابھی رپورٹ کرتا ہے۔

عورت نے بچہ کو سنبھالا اور تعلیم یافتہ بیوی کا منہ تکتی ہوئی باہر آ بیٹھی۔ تراہد یہ منظر دیکھ لڑ گئی اور خود بھی برقع اوڑھ باہر چلی آئی۔ عورت کی حالت نہایت خراب تھی۔ بچہ نے اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر کر دی تھی۔ اس کے منہ کو تکتی تھی پیار کرتی تھی روتی تھی اور بیتاب ہوتی تھی۔

تراہد نے پوچھا

”یہ کب سے بیمار ہے آپ اس کو کیا دوا دے رہی ہیں اور آپ کو جانا کہاں

ہے؟“

عورت۔ بیوی کیا بتاؤں کیوں پوچھتی ہو کیا فائدہ دنیا کے جھگڑے ہیں چل رہے ہیں۔ جب تک زندہ ہوں چلتے رہیں گے۔

تراہد۔ ”آخر آپ بتائیے تو سہی بتانے میں کیا نقصان ہے؟“

عورت۔ میں شاہجہاں پور کی رہنے والی ہوں۔ وہیں بیاہی گئی میرے بہاڑ پڑ کر تھے زلزلہ میں ہمارا تمام مکان اور آدمی دب گئے۔ اور میرے سرے دونوں کا سایہ اٹھ گیا۔ ایک شخص نے جس کا نام بھول گئی ہم کو آکر

اطلاع دی کہ میری اماں جان مرقی دفعہ زیور کسی کے سپرد کر گئی ہیں۔ کسی معتبر آدمی کو بھیج کر وہ منگوا لو۔ کوئی صاحب مدرسہ میں احسان ہیں ان کی بیوی کے پاس امانت ہے۔ میرے میاں بیمار تھے اور ہمارے پاس اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ اتنی دور کا سفر کر سکیں کہ ان کی بیوی کی اماں کا خط آیا اور ہم پہاڑ روانہ ہو گئے میاں بیمار تھے پہاڑ پہنچ کر اور بھی مرض بڑھ گیا اور پانچ روز میں چیٹ چیٹ ہو گئے۔

بیوی کس کس کو روؤں ماں کو باپ کو شوہر کو، میں اکیلی یا یہ دو برس کا مصمم پتہ پوچھ پوچھ احسان صاحب کی بیوی کے پاس پہنچی۔ انہوں نے وہ گالیاں دیں کہ خدا کی پناہ، اُن کے ابا مارنے دوڑے اور گھر سے نکال دیا۔ سرائے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے شرارت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا ایک رات سرائے میں کاٹنی قیامت ہو گئی۔ اسی حالت میں دن نکلتے ہی وہاں سے بھاگی سرائے والے نے جو اسباب تھا وہ اپنے دامن میں چھین لیا۔ اب میرے پاس سو اس لال کے جو میری گود میں ہے یا ان کپڑوں کے جو بدن پر ہیں اور کچھ نہیں ارادہ ہے کہ پاؤں پاؤں چلی جاؤں بیوی اس بچہ کو کیا پوچھتی ہو بن باپ کا ہے اگر اس کا باپ ہوتا تو دقت مجھ پر یہ مصیبت نہ ڈھاتا اور۔

واسطے ایک ایک پیسہ کے شربت کو نہ ترستی۔ یہ۔
کا ہے جس کو تمہارے سامنے میرے ہی جیسو۔

ہوگی کھانسنے کے جرم میں مسافر خانہ سے با
دیکھو تو ہسی یہ کیسے سانس لے رہا ہے
نہ کیونکہ اسے چاند آنکھ کھول! اسے بہ
صدقہ! اپنے ماتھ پاؤں کا طفیل، یہ

کہ میں بھیک مانگ کر اس کے واسطے تھوڑی سی چار لے آؤں۔ مائے سوی
خدا کے واسطے بتاؤ اس کو کیا ہوا ہے؟

زاہدہ: آپ گھبرائیے نہیں خدا پر بھروسہ رکھئے وہی فضل کرنے والا
ہے۔ بچہ کو آپ شوق سے میری گود میں دیدے بجئے آپ کو خود جانے کی ضرورت نہیں
میں ابھی چائے منگواتی ہوں۔

اتنا کہہ کر زاہدہ اٹھی اور احسان سے چائے کی پیالی اور ایک انڈا منگوا کر
بچہ کو دیا۔ بچہ اصل میں سردی مان گیا تھا۔ چائے پیتے ہی آنکھیں کھول دیں اور ماں
سے کہنے لگا۔

”میری بھوک“

قارون کی دولت، روسے زمین کی سلطنت کوئی چیز ایسی نہ تھی جو بد نصیب
ماں کی نگاہ میں ان دو لفظوں سے زیادہ وقعت رکھتی۔ فرط محبت میں بتیاب ہو کر
چمٹ گئی۔ زاہدہ نے انڈا اچھیلا اور بچہ کو دیا۔ ادھر تو چائے پی۔ ادھر کھایا انڈا، ادھر
سے زاہدہ نے یہ ہشیاری کی کہ چاروں طرف سے رضائی سمیٹ کر خود ہوا کی طرف
مٹھی اور بچہ کو اچھی طرح دبکایا پسینہ آیا اور اس شدت سے کہ اس جاڑہ میں زاہدہ
سے دانت بچ رہے تھے۔ اس کی گود اور بچہ کے کپڑے سب چوڑا تھے،
”اے جان آگئی اور عورت سے کہا۔

مکتی ہیں۔ جو آپ کے پاس زیور کے سلسلے میں گیا تھا۔“

پر ہی رکھا ہے۔ دیکھئے!

”اتھ کا لکھا ہوا تھا ”منت کہا آپ دو تین

لے چلئے“

سان کا میں کسی طرح شکریہ ادا نہیں کر سکتی

آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا اس کا اجر آپ کو خدا دے گا۔ میں نے اس سفر میں مسلمان مردوں کا جو تجربہ کیا خدا اس سے سب کو بچائے آپ تو یہ دعا کیجئے کہ میں کسی طرح اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ پھر انتشار اللہ گھر سے باہر قدم نہ رکھوں گی روکھی روٹی اور چنے اچھے، اپنا کونہ بھلا اد آپ بھلے۔

زادہ۔ آپ کا یہ فرمانا نہایت درست ہے۔ مگر آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ میں آپ کو اپنی حقیقی بہن کی طرح رکھوں گی۔ آپ کی عزت اپنی عزت اور آپ کی تکلیف میری اپنی تکلیف ہے۔ میں اس کا شاہد خدا کو کرتی ہوں کہ آپ کو دغا نہ دوں گی۔
عورت۔ ”خدا سے زیادہ تو کوئی نہیں ہے اور آپ کے احسانات نے مجھ کو واقعی گرویدہ کر لیا ہے۔ اگر آپ یقین دلاتی ہیں تو بہت اچھا۔ مگر میرے پاس کرایہ نہیں ہے۔“

زادہ۔ ”آپ اس کا خیال نہ کیجئے۔“
عورت۔ اتنا خیال رکھئے کہ میں ایک بد نصیب عورت ہوں۔ گو میرے سر سے وارث اٹھ گیا اور میں تنہا ہوں۔ مگر آپ کی نیت میں خرابی ہوئی تو میری جان کا امداد اس بچہ کا عذاب آپ کے سر ہوگا۔
زادہ۔ ”آپ کیا فرما رہی ہیں اور کیا سمجھ رہی ہیں۔ آپ مطمئن رہئے۔ آپ کو دھوکا نہ ہوگا۔“

زادہ، احسان اور عورت تینوں گھر پہنچے۔ عورت نے دروازہ میں کھڑے ہو کر پہلے اپنا اطمینان کیا۔ عورتوں کے بولنے کی، لڑکیوں کے کلام اللہ پڑھنے کی آواز سے دل ٹھکا تو آمد داخل ہوئی اور ایک کونہ میں چپکی بیٹھ گئی۔
تاہم لے ماں سے مفصل کیفیت بیان کی تو اس نے زبردستی ہلا کر اندر بٹھایا اور بھائی کو جو شاہجہاں پور گئے تھے بلایا۔ انہوں نے بچہ کو پیچھا۔ خطا مبرجہ ہوئی تھا۔

زادہ نے چپکے سے زیور کی پوٹی نکالی اور سامنے لا کر رکھی۔ عورت کی آنکھ سے خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ اور جب یہ الفاظ سُننے کو
 ”بیوی معاف کرنا میں نے اطمینان کی وجہ سے یہ دیر لگائی“
 تو دوڑ کر لپٹ گئی اور کہا۔

”میں آپ کے احسان جب تک زندہ ہوں فراموش نہیں کر سکتی“
زادہ۔ ”یہ آپ کا کرم ہے میں نے درحقیقت آپ کو اسی واسطے تکلیف دی تھی۔ کیونکہ ماں جان کا خط میں دہیں پہچان لیا تھا۔ اب یہ آپ کا گھر ہے جب تک جی چاہے شوق سے رہیے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو میں نے ماموں جان کو رضامند کر لیا ہے وہی آپ کے پاس گئے تھے۔ ضعیف العمر آدمی ہیں اطمینان سے پہنچا دیں گے“

عورت۔ ”ہاں اگر اب گاڑی کا وقت ہو تو مجھے بھجوا دیجئے“
زادہ۔ ”جی ہاں وہ اسی وقت کی گاڑی میں آپ کے پاس گئے تھے۔ میں لے دریافت کیا تھا“

عورت۔ ”بہت اچھا“
 زادہ نے گاڑی منگوائی۔ جب عورت دروازہ میں پہنچی تو ساجدہ نے آکر مہمان کو گلے لگایا اور کہا۔

”یہ کھانا رکھ لیجئے رستہ میں کام آئیگا۔ یہ زیور اس بچہ کی تعلیم کے واسطے رکھے اور اپنے اخراجات شتم بستم پورے کیجئے۔ یہ کچھ روپے ہیں۔ آئندہ پھر پہلی تالیخ کو جو کچھ میں بیجوں اپنی عنایت سے قبول فرما کر مجھے منون فرمائیے“
 گاڑی موجود تھی۔ عورت اپنے بچہ کو لیکر اندر بیٹھی۔ بڑے میاں باہر اور اس طرح زادہ اپنے مہمان کو رخصت کر بار امانت سے سبکدوش ہوئی :

بائیسواں باب

بے شمار پھول باغوں میں کھلے اور مرجھائے لاتعداد روحیں دنیا میں آئیں اور گئیں، آج ان پھولوں کا نشان اور ان زندگیوں کا پتہ دنیا سے جات میں نہیں، پھول مرجھانے کو پیدا ہوئے اور زندگیاں ناپید ہونے کو آئیں، فنا ہونے والے پھول نہیں ہیں۔ ان کا سُرناغ نہ لگے۔ مگر ان کی جگہ رابھی ہوا میں موجود ہے اور بلبل کے بسے ہوئے پر ان کی زندگی کا نشان دے رہے ہیں۔ مرنے والوں کی ہڈیاں گلگرہ خاک ہو گئیں۔ ہوا ان کا غبار تاراج و برباد کر چکی۔ مگر ان کے کارنامے ابھی اس دنیا میں ہیں اور جب تک دیکھنے والی آنکھیں موجود ہیں روشن رہیں گے وقت اسلام کے دوزخندہ جوہر خاک میں ملا چکا اور وہ پاک نفوس جو اسلام کا بول بالا کر گئے۔ خود زمین کی تہ میں اور ان کے نام آغوش تاریخ میں بے خبر پڑے ہوئے ہیں۔ بسا غنیمت تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کہ مغرب کی خوشنما پری کا حسن صرف مردوں ہی کی آنکھیں مسخر کر رہا تھا اور اسلام کے صدا بہار پھول گھروں کے چپہ چپہ پر جھک رہے تھے۔ مگر قیامت تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز کہ یہ روماند تھی ہوئی گھروں کے اندر پہنچی اور مایہ ناز ہستیاں جو عورت کی حیثیت میں مسافر اسلام کے نقش پا کا نشان دے رہی تھیں شرابور ہو گئیں۔ لڑکیوں کی تعلیم جدید کا غلغلہ درودیاور سے بلند اور ترقی قوم کی صدائیں دڑے دڑے سے اونچی ہوئیں کوشش معقول اور صداستحسں تھی۔ کاش وارہ مذہب کے اندر اور اصول اسلام سے وابستہ ہوتی۔ مگر زمانہ کی رفتار خیر آبرواتھیں لے تھی آئین چن چن کر اور ثنائیں چھانٹ چھانٹ کر ذبح کیں۔ آبائی جوہر پامال اور ارکان مذہب و بان کے لڑکیاں آزادی کی ہوا میں ترقی کے نعرے لگاتی مشرق پر لعن طعن کرتی تھیں۔

میں آئیں۔ مذہب کے جھگڑاتے زیور اُتار کر الگ پھینکے۔ اور آج وہ وقت ہے کہ جن گھروں میں صدائے اللہ اکبر کیلچہ دہلا دیتی تھی اور گھروالیوں کے سر مالک حقیقی کے حضور میں جھک جاتے تھے وہاں موزن کی اذان گونجتی ہوئی جا کر اور موسیقی سے نکراتی ہوئی واپس ہوتی ہے :

زمانہ اس رنگ کو بہت کچھ چمکائیگا۔ تعلیم جدید کی شیدا ہوئیگی۔ ہونگی خاک نہیں۔ مگر سمجھیں گی کہ ہم تعلیم یافتہ اور بڑی بڑی ہیاں جاہل مطلق۔ مگر گمان غلط اور وہم لغو ہوگا اگر ایمان کی روشنی دل میں موجود ہو تو انصاف کی نظریں اونچی کرو اور ان صورتوں کو دیکھ لو جو اب کوئی دم کی ہمان ہیں۔ یہ سماں جلد بہت جلد آنکھ سے اوجھل اور نظر سے چھپنے والا ہے۔ ترقی کے نعرے لگاتے ہوئے غول سرکوں پر کھائی دیں گے۔ مگر کونوں میں دبک کر ترقی کی دعائیں مانگے والیاں زمین کا پیوند ہوئیگی : یہ وقت نہ ہوگا اور یہ باتیں خواب و خیال ہو جائیں گی۔ مگر وہ دن آئے گا اور ضرور آئیگا کہ مسلمان جس کو منزل مقصود سمجھ رہے ہیں وہ بیابان قیامت خیز ہوگا موجودہ تعلیم نسواں اسلئے کہ مذہب کا شان و گمان تک نہیں وبال جان ہوگی آسمان اس وقت بتا دے گا کہ وہ آن بان والیاں جو آج قبرستان کی زینت ہیں۔ لاریب مسلمان تھیں جو **ہر قدامت** مٹ چکے اور اب سوالیک آدھ گھر کے ان کا نام و نشان تک نہیں۔ مگر وقت آئے گا۔ آئے گا اور ضرور آئے گا کہ دنیا سے اسلام ان واقعات کو آنکھوں پر رکھے گی :

بے غیرتی کی انتہا اور بے حیثی کی حد تھی کہ یہ کچھ ہو گیا۔ مگر شاہدہ بد نصیب کے مکان میں جو بیٹیاں تہذیب جدید کی گھس چکی تھیں وہ نہ نکلیں۔ عزت گئی۔ آبدگی۔ باپ اور اکا نام ڈوبا۔ بزرگوں کی ناک کٹی اور اگر سچ پوچھو تو صورت دکھانے کے قابل نور کر کے کے لائق نہ رہا۔ مگر جی ہوئی عادتیں، چڑھے ہوئے مذہب، اور پڑے

ہوئے لپکے کسی طرح نہ چھوٹتے تھے اور نہ چھوٹے۔ ماں کے بعد باپ نے یہ سمجھا اور سمجھا کیا سمجھنا چاہئے تھا۔ کہ جو کچھ ہے سب حسن کا جیتے جی اس کا۔ مرے بعد اس کا پھر میں نے کیوں چار دن کی زندگی کے لئے برائی سہری۔ بیٹے بہو کو بلا گھر با چیز بست علاقہ جاویدا سب سپرد کر دیے۔ بلا تو پہلے ہی لیا تھا۔ مگر پورا قبضہ اب ہوا۔ حسن ٹھوکر کھا چکا تھا اور ایسی کہ پہلے ہی حملہ میں تارے دکھائی دے گئے مگر مغربی ہند کی دلدادہ تعلیم یافتہ بیگم کے بھانویں بھی نہ تھا۔ روپے کی ریل پیل ہوتے ہی مہی بیوی تمہیں اور وہی کلب کے جلسے۔ آزادانہ تفریح اور دلہن سیر ہوئی کا واقعہ حسن کو راہ راست پر لے آیا اور نخوت و تمکنت سب رفو چکر ہوئی خدا کے سامنے سر بھی جھکنے لگا اور زبان بھی۔ جو شخص مسلمان سے سیدھے منہ بات کرنا کسر نشان سمجھتا تھا وہ کڑکھڑاتے جاڑوں میں صبح کی نماز مفلسوں اور غریبوں کے برابر کھڑے ہو کر جماعت سے بڑھتا۔ اب البتہ میاں بیوی کے فرائض میں زبردست اختلاف کی بنیاد پڑی۔ میاں مغرب کا دشمن، اسلام کا شیداء، جدت سے نفرت، شہرت سے وحشت، بیوی ترقی کی عاشق، مذہب سے دور، نام کی غلام، کام کی دشمن! حسن کو وقت نے ٹھیک بنایا اور حسن کا رنگ دیکھ کچھ تو صحبت کا اثر اور کچھ دکھائی دی موت۔ باپ بھی اسی طرف ڈھلا۔ اب گھر بھر میں ترقی کی حافظ اگر نہیں تو بی شاہدہ۔

گلابی جاڑے تھے۔ رمضان کا مہینہ شروع ہوا۔ شاہدہ کا لڑکا اس وقت خاصا اشارہ دس سال کا تھا اور گوماں کی صحبت نے بھی اندر تربیت نے بھی اس کا تاس کرنے میں کمی نہ کی تھی۔ مگر باپ کی احتیاط اور احتیاط کے ساتھ کوشش نے اس کو تھوڑا بہت مسلمان بنا دیا تھا۔ روزہ کی خبر شاہدہ بہت روز سے سن رہی تھی اور تبس رہی تھی تیر ہواں روزہ تھا کہ حسن نے ماس کو بلایا اور اس کے سامنے بیوی سے کہا۔

کل منجھلا روزہ ہے۔ کچھ کو روزہ رکھوادو آخر یہ بھی ہم پر فرض ہے اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

شاہدہ۔ ”فرض کی خوب کہی۔ اس کا روزہ ہم پر فرض۔ یہ اس سے بھی تیز رہی تعجب تم پر ہے کہ ایسا کیا یہ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا کہ ان ڈھکوسلوں کا کلمہ پڑھنے لگے۔ روزہ کی ضرورت اسلام کے ابتدائی دور میں بیشک تھی اس لئے کہ مسلمان یوں بھی فاقہ مرتے تھے۔ روزہ کے لایجج نے ان کو ثواب عاقبت کی تقویت دیدی۔ مگر اب روزہ کو ضروری سمجھنا میری رائے میں غلطی ہے جو کچھ ملانے کہتے ہیں اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان فاقہ کی بحلیف محسوس کر سکے۔ چنانچہ ہر شخص کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرح ایک آدمہ وقت کا فاقہ کر لیتا ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ آدمی فاقہ کی اذیت محسوس کرنے کے بعد اپنا مال فاقہ کرنے والوں کے حوالے کر دے۔ میں یقیناً اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ میرا بچہ محض تمہاری عقلمندی سے یہ مصیبت بھگتے۔ علاوہ ازیں یہ روزہ کی شادی کیسی کہ تم مہمان جمع کرنے کی فکر کر رہے ہو۔ بہت سے کام ہیں جہاں روپیہ مناسب طور پر صرف ہو سکتا ہے، روپیہ اس واسطے نہیں ہے کہ بھگتے۔ اگر مزے اٹائیں اور میرا بچہ روزہ کی مصیبت بھگتے،“

حسن۔ ”کس قدر افسوس ہے تمہاری عقل پر کہ تم نے بالکل ہی مذہب کو کھو دیا اور ایسے ایسے سخت کلمے تمہاری زبان سے نکلتے ہیں۔ تم اگر اپنے تنہیں مسلمان کہتی ہو تو تم کو خرم آتی چاہئے کہ تم اسلام کی اس طرح اپنے منہ سے توہین کر رہی ہو۔“

شاہدہ۔ ”میں بیشک مسلمان ہوں اور تم سے بہتر فرق اتنا ہے تم نے اسلام کو نہیں سمجھا میں نے سمجھ لیا۔“

حسن۔ ”اگر تعلیم کا یہ ہی منشا رہے کہ آدمی مذہب چھوڑ دے تو میں کہتا ہوں تعلیم گناہ سخت گناہ۔“

شاہدہ۔ "اگر مذہب کے یہ ہی معنی ہیں جو تم سمجھ رہے ہو تو تم کو تمہارے مذہب کو تمہارے خدا کو سب کو سلام"

حسن۔ "اس قسم کی لغو باتیں تم کو ایک دفعہ پورا مزہ چکھا چکی ہیں اور ابھی تک نا فرامانی اور غورانی کی گفتگو کرتی ہو۔ تم کو جو سزا ملی وہ خدا کا غضب تھا جو تمہارے اوپر ٹوٹا"

شاہدہ۔ "مگر تم نے کیا قصور کیا تھا"

حسن۔ "جتنے کے ساتھ گھن پس گیا۔ تمہاری وجہ سے میں بھی لپیٹ میں آیا"

شاہدہ۔ "اور تمہاری ماں کی موت کون سے خدا کا عذاب تھا"

حسن۔ "وہ تو وقت سے مر میں اپنی عمر سے مر میں اپنے ٹھکانے پر مر میں"

شاہدہ۔ "مگر جاہل عورتوں کی عمر تو زیادہ ہوتی ہے ان کی عمر ایسی تو نہ تھی"

حسن نے بیوی کے اس فقرے کا کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اس کی طبیعت بگڑ

گئی اس کو مری ہوئی ماں کے متعلق یہ الفاظ بہت ناگوار ہوئے۔ دو تین لمحہ خاموشی

رہی۔ اس کے بعد شاہدہ نے کہا۔

"اگر روزہ ضروری ہے تو یہ شادی کیا معنی رکھتی ہے۔ روپیہ صرف کرنا کوئی

قومی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جو دن رات ان رسموں کو پیٹ رہے ہیں تو اسی واسطے

کہ مسلمان تنہا اور برباد ہو چکے اب ان کے پاس کچھ نہیں ماں یہ رسمیں باقی رہ گئیں جو

ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑی ہیں اور جہالت کے کھلے ہوئے کرشمے ہیں۔ کون ایسا

آنکھوں کا اندھا ہو گا جو اتنی بات نہ سمجھ سکے کہ جس قوم میں افلاس کی چاروں طرف

پکا ہموار ہی مودہ ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ روزہ کی شادی پر اٹھا دے۔ مدرسے ہیں، تیمم

خانے ہیں، انجنیں ہیں، ان کو دو تو قوم کو کچھ فائدہ پہنچے۔ مسلمان مصیبتوں سے رہائی پائیں

نہ کہ یہ غضب کہ روزہ کی شادی ہو۔ جہان کھاتے پیتے آکر جمع ہوں۔ کوئی برائی مانگے

اور کوئی منتہی نہ ہو۔ کیا اس سے زیادہ کوئی گناہ ہو گا اور اس کی باز پرس خدا کے ہاں نہ ہو گی یہ اماں جان برا بڑبڑاتی ہیں اور خدا اور رسول کو جانتی اور پہچانتی ہیں۔ خدا کے واسطے ذرا مجھ کو جواب دیں۔ یہ بتائیں تم بتاؤ۔ انشا اللہ دونوں ایک سے ایک افضل ہیں۔ کوئی تو اس عقدے کو حل کر دے یہ شادی اچھی یا قوم کی بربادی کا خیال اچھا؟

ماں۔ تمہارا خیال بظاہر درست اور تمہاری رائے دیکھنے کو معقول

اور ماننے کو نہایت اچھی ہے اور ہم بھی اس رائے کی تائید اور اس خیال کی درستی سے متفق ہیں۔ بیشک میں اور ضرور ہیں۔ مگر تمہارے خیال میں کچھ بحث کی ضرورت اور تھوڑے اختلاف کی حاجت ہے بشرطیکہ ناگوار نہ ہو اور برا نہ مانو ہم کو تم سے اس معاملہ میں اتفاق ہے کہ ان رسوم نے جو دوسروں سے

لی گئیں یقیناً مسلمانوں کو تباہ کیا بلکہ ہم یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ عام طور پر مسلمانوں کا بڑا حصہ رسوم کی بدولت پریشان ہوا۔ مگر اس سلسلہ میں سب سے پہلے رسم کی نوعیت اور ادا کرنے والے کی حالت پر غور کرنا ہو گا۔ رسم مفلس کے واسطے رحمت اور مالدار کے لئے رحمت ثابت ہو گی بشرطیکہ اعتدال سے آگے نہ بڑھے۔ انجنوں

تیموں، عربوں۔ اپاہجوں کی خدمت سے کس کو انکار ہے مگر سب سے پہلا حق تو ہمارے اوپر ہمارے عزیزوں کا ہے وہ عزیز جن کو روٹی کپڑا کچھ بھی میسر نہیں۔ تمہارے سیکے اور سسرال میں کیسی کیسی دکھیا رہی رائیں اکیسے کیسے یتیم معصوم بھرے پڑے ہیں کیا تم کہہ سکتی ہو، تمہارے میاں بتا سکتے ہیں کہ رمضان بھر میں کتنی مرتبہ اپنے

دسترخان سے اٹھا کر دو روٹیاں ان کو بھیج دیں، جوان لڑکیاں معذور بڑھے،

غریب بچے فاقوں سے سوئیں اور ننگے پھریں کیا تمہارا دل بد نصیبوں کی مصیبت پر پسینا اور حاجتمندوں کی حاجت پر کڑھا، یہ دیوار پنج نصیر آڈیٹر سال کی بیابھی

رائڈ بیٹھی ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے زڈا پا کاٹ دیا اور آن میں فرق نہ آیا

تمہارے میاں کی حقیقی خالہ زاد بہن ہے، مگر میں جانتی ہوں کہ تمہارے ٹکڑے کی شرمندہ نہیں۔ یہ رسم و حقیقت رسم نہیں ہے ایک بہانہ ہے کہ تمام عزیز اقارب ایک جگہ جمع ہو کر ایک گھر میں بیٹھ کر ایک دسترخوان پر کھانا کھالیں اور اس سلسلہ میں امیر کے پیسہ سے غریب بھی مستفیض ہو جائے۔ کیسی شادی اور کیسا جلسہ معبود حقیقی کا شکریہ کہ تو نے اس بچہ کو اس قابل کیا کہ ہماری زندگی میں یہ تیرے حکم کی تعمیل کرتا ہے اس مسرت میں جو تو نے ہم کو عنایت کی ہم تیرا شکریہ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اپنے عزیزوں کو جو تیرا حکم ہے تیرے حاجتمند بندوں کو جو تیرا ارشاد ہے کھانا کھلا کر خوشی کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے دکھے ہوئے دل سکھ پا کر دعا کریں۔ تو قبول کرے اور ہمارے بچہ کی عمر میں ترقی ہو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ضرورت کے موقع پر دو۔ بیٹی کوئی خواہ مخواہ نہیں دیا کرتا۔ دیتے و ان میں جہاں اپنا کام ہو یا نام۔ وہ دینے والے کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ قبروں میں جا سوئے اب اگر ایسے موجود ہیں تو وہ دین شوق سے دیں اس سے بہتر کام اور کیا ہو گا۔ مگر اس لئے کہ بیٹے کے روزہ کی شادی ہے۔ بعض اسی مانتا میں شخص خوشی خوشی روپیہ صرف کر دے گا۔

اسی واسطے یہ سلسلے بڑوں نے مقرر کر دیئے اور وہ بھی ان لوگوں کے واسطے جن کے پاس ہے۔ ان کے لئے ہیں کہ گھر میں نہیں کڑی کئے والے ہوتا فرض لیا نام کیا بھیک مانگی۔ گردی رکھا اور شادی رچا بیٹھے۔ ان کے واسطے تو یہ ثواب سخت عذاب ہے۔ وہ رسوم جن میں ذمی القربے کی تعمیل ہو ہمارا ایمان، وہ رسمیں جن میں غریبا امیروں سے مستفید ہوں لاریب جائز، وہ رسمیں جو ہماری روایات کو زندہ رکھیں۔ بلا شک درست، خدا نے اپنے فضل و کرم سے تم کو دیا ہے اور ضرورت سے زیادہ۔ یہ صرف تمہاری ملکیت نہیں۔ تم لاکھ اپنا مال اور ہزار اپنی

چیز سمجھو مگوں میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں اور سب بڑا حق، سب بڑا حصہ، اسی دینے والے کا ہے جو دینے کی قدرت رکھ کر، لینے کی طاقت رکھ کر، یتیم کی صورت میں فقیر کی ہیئت میں تمہارے دروازہ پر آئے، تمہارے پڑوس میں رہے، تمہارے محلہ میں رہے، تمہاری دنیا میں بے، کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے اپنی تمام عمر میں کبھی بھی اس نیت سے، اس خیال سے، اس ارادہ سے کسی حاجتمند کی ضرورت، کسی بد مصیبت، کسی دکھیااری کا دکھ، دور کیا، پورا کیا، رفع کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، کبھی نہیں، قطعی نہیں! پھر تم ہی بتاؤ کہ اگر اسی بہانے دولت نیگ لگی، تمہارا بیڑا پار ہوا، تمہاری عاقبت سنور گئی تو اچھا ہوا یا بُرا۔ میں ان لوگوں کی دشمن ہوں جو خود کسی قابل نہیں۔ مگر مصیبت میں پھنس کر آفت میں گھر کر، قرض لیکر رہیں ادا کریں اور اسی طرح ان لوگوں کی بھی جو مالدار ہو کر، دو لہند بن کر، روپیہ رکھ کر، ضروری رسم سے بچیں اور روٹی کا ایک ٹکڑا، روپیہ کا ایک پیسہ، تھان کا ایک چٹھڑا، خدا کی راہ پر نہ دیں۔ تمہارے یہ دونوں چھو کرے تین سال سے تمہاری غلامی کر رہے ہیں یہ آج بن ماں کے ہسی بن باپ کے ہسی مگر کبھی کلیجہ کے ٹکڑے اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی تھے اس وقت وہ آنکھیں بند اور وہ کلیجے موجود نہ ہوں۔ مگر یہ مسلمانوں کی اولاد میں تم بننا سکتی ہو کہ اس عرصہ میں تم نے کتنی مرتبہ ان کو کلیجہ سے لگایا اور کے دفعہ گھر کا جھڑکا۔ ڈانٹا پیٹا۔ کیا یہ صرف اسی لئے پیدا ہوئے تھے کہ مائی محبت اور باپ کی شفقت سے محروم ہو کر درد کی ٹھوکریں کھائیں؟ کیا ان کی عمر اس قابل نہ تھی کہ تم ان کو تعلیم دیتیں اور یہ پڑھ لکھ کر کسی لائق ہوتے؟ ان کی صورت اگر آنکھیں ہوں، ان کی حالت اگر کان ہوں کچھ دکھاتی ہے، کچھ سناتی ہے۔ غصہ ہونو کچھ بتاتی ہے اور ایمان ہونو کچھ کچھ طلب کرتی ہے۔ یہ تمہارے کلمہ کے شریک تمہارے مذہب کے ساتھی اور تمہاری قوم کے بچے ہیں جو روکے ٹکڑے کھا کر اور جھٹیڑے پہن کر زندگی بسر کر رہے

ہیں۔ انہوں نے زبان سے نہیں، اپنی حرکات سے، انہوں نے منہ سے نہیں اشارات سے، اپنی کتھا تم کو سنائی، اپنی مصیبت تم کو بتائی، مگر تمہارا دل نہ پسچا، لیکن اس روزہ کے طفیل تمہارے بچہ کی بدولت اور اس رسم کے صدقہ میں ان کا تھکے گا اور ان کا پیٹ بھرے گا۔

حسن میاں بچہ کو روزہ رکھواؤ اور گرد گرد اگر معبود حقیقی سے التجا کرو کہ وہ اس کی بہار تم کو دیکھنی نصیب کرے اس کی عمر میں برکت دے اور اس کا صدقہ تم کو نہ دکھا مخنا جوں کو کپڑے پہناؤ۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ روزہ اور گرد گرد اذکار اے حاکم حقیقی! میری التجائیں اور جو بچہ آج روزے کا دو لہجے اس کو دلہن کا دولہا بننا نصیب ہو۔

تیسواں باب

شوہر کی بیکاری کا زاہدہ کے دل پر ایسا کاری زخم اور گہرا صدمہ تھا کہ وہ باپ کی طرف سے کم اور ماں کی طرف سے کافی۔ ساس کی طرف سے تھوڑی اور خسر کی طرف سے معقول، مدد اس کو مل رہی تھی۔ مگر وہ رعایت مصیبت اور سلوک غذا سمجھتی تھی۔ مجبوریتی اور لاچار صرف کرتی۔ مگر دو چار دفعہ نہیں یہ اس نے بار بار کہا کہ ”میاں کی کمائی کا ایک پیسہ اس ڈسیر سے اور سوکھی روٹی اس تورم سے افضل اور بہتر بیوی کا خیال کسی نہ کسی ذریعہ سے میاں کے کان تک پہنچتا اور یہ کچھ نہیں کہ وہ اس سے متاثر نہ ہوتا اس کی خود رائے یہ ہی تھی اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ بڑے باپ اور امیر خسر کی کمائی میں خواہ مخواہ سانجھاڑا نا انتہا سے بے حیثیتی ہے۔ مگر کرتا کیا دن دن بھر مارا مارا پھرا، رات بھر نمازیں پڑھیں، مگر روزگار نہ ملا، احسان کی وہ خوں شاں اور طعراق سب پہاڑ ہی تک تھی۔ گھر آکر ادھر تو روپیہ کا ٹوٹا، ادھر دوستوں کے کچھ کے، اور سب سے بڑی مصیبت پریشانی، غرض وہ صاحبیت تو پہاڑ سے

چلتے ہی چلتے کم ہو گئی رستہ میں اور بھی جھو جھری ہوئی اور گھر پہنچ کر تو وہی کورا
 احسان تھا۔ مصیبت وہ انکس ہے کہ بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں ٹوڑ کر سیتے
جھکاویں۔ احسان تو کس گنتی میں تھا دو چار دن تو ذرا اکڑا رہا۔ مگر پھر جو جھکا تو یہ حال
 تھا کہ کسی وقت کی نماز ناغہ نہ کرتا زائدہ پہلے ہی وظیفہ اور تسبیح کی اتنی دلدادہ تھا کہ
 بچپن ہی میں کنبہ بھر حن جن کہتا تھا اور اب تو یہ حال تھا کہ حصن حصین کا ختم یا غفور
 کی تسبیح یا کریم کا وظیفہ دن رات تھا ہر حال میاں بیوی کی التجا کا اثر تھا یا صرف میاں
 کی کوشش کا نتیجہ احسان کو ایک جگہ ملی اور اچھی ملی۔ ہم اس موقعہ پر زائدہ کی تعریف
 جس قدر کریں وہ کم۔ اس نے پہلی تنخواہ ما تھ میں آتے ہی غریبا کو کھانا کھلایا اور تمام عزیز
 اقارب کو جمع کیا، مولود شمیرین پڑھا اس سلسلہ میں وہ دونوں پھوپھی بھتیجیاں رحیم اور
 منیرن جو شاہدہ کے ہاتھوں حوالات میں پہنچی تھیں جس وقت آئی ہیں اور زائدہ ہانوں
 کو چھوڑا اندھی رحیم کو لینے گئی ہے تو ہر منقش اس کا مداح تھا۔
 ذکرِ دلاوت کے بعد زائدہ نے یہ تقریر کی :

”بزرگ ماؤں اور عزیز بہنو! آپ نے حضور کریم کے حالات سن لئے
 اور دیکھ لیا کہ وہ ذات پاک جو غریبوں کا ملجا اور یتیموں کا مادی ہے
 کس طرح دنیا میں رہی۔ اور کیونکر یہاں سے رخصت ہوئی۔ اس
 پاک زندگی کا ہر واقعہ اور واقعات کا ہر حصہ ہم کو اسلام کے
 معنی بتا رہا ہے۔ سرورِ عالم کے بعد خلفائے راشدین کا دور
 ہم سے آباد و بلند کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ مذہب کو ساتھ لیکر
 دنیا میں ترقی کی۔ تاریخ سے بڑا شاہد کون ہوگا جس نے ہم کو
 اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسلام کی منحوس گھڑی وہ تھی جب

مسلمان مذہب سے علیحدہ ہوئے۔ مصیبت کی گھٹائیں اسی وقت
سروں پر چھائیں (فلاس کے بچے اسی حالت میں نیز اور زلّت کے
پہاڑ اسی وقت چاروں طرف سے نمودار ہوئے اور نوبت یہاں
تک پہنچ گئی کہ ہم جو علوم و فنون میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ جاہل مطلق
بن گئے۔ خدا غریقِ رحمت کرے سرسید کو کہ انہوں نے بذمہ
قوم کی جو عرصہ حیات میں دم توڑ رہی تھی۔ نبض دیکھی اور مرض
پہچانا۔ نسخہ لکھا اور دوا دی۔ ہم اپنے عروج کو تو کیا پہنچتے۔ گزیر
نامے ہاں ہو گئی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس جدوجہد کا نتیجہ حسب توقع
خوشگوار نہ نکلا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہی ہے کہ مذہب کا لحاظ
کامل طور پر نہ کیا گیا وہ تجویزیں ختم وہ کوششیں پوری اور وہ منصوبے
کمل ہو چکے اور جن دماغوں میں عقل اجن آنکھوں میں روشنی، اور جن
دلوں میں ایمان موجود ہے ان کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اندھی
تقلید اور دوریِ مذہب نے جو بربادی کا پیش خیمہ تھی ستیا ناس
کر دیا۔ اب ہمارے سامنے تعلیم نسواں کا مسئلہ ہے اور یہ کہنا کہ
مسلمان اس کی اہمیت کو سمجھ گئے غلط ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ اگر میں یہ
کہوں کہ مسلمانوں پر یہ الزام ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔
مسلمانوں نے تعلیم کے متعلق حضور اکرم کے ارشاد کو ہمیشہ سر آنکھوں
پر رکھا۔ مگر انہوں نے اس تعلیم کو جو آج کل دی جا رہی ہے۔ تعلیم نہ سمجھا
انہوں نے یہ جائز خیال نہ کیا کہ اپنی روکیوں کو جن کے جوہر عصمت کے
معاملہ میں وہ دنیا کی ہر نئے کو بیچ سمجھتے تھے اپنی آنکھ سے ایک
لمحو بھر کے لئے اوجھل کر دیں۔ آج کی دنیا اس کو غلط کہہ دے مگر خیال

یعنی معقول اور فیصلہ بلا شک صحیح تھا۔ وقت نے ان کو عاجز اور ضرورت نے ان کو لاچار اور زمانہ نے ان کو مجبور کیا۔ دوت ان سے گئی۔ حکومت ان سے چھٹی۔ سلطنت ان سے گئی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اگر ان کو دنیا میں زندہ رہنا ہے تو اپنے گھروں میں بیٹھ کر اپنے کونوں میں دبک کر، اپنے کھنڈوں میں سکڑ کر اپنی آبرو کو دونوں ہاتھوں سے بنائیں، بڑوں کی عزت کو کلیجہ سے نگائے خاموش بیٹھیں اور اپنا بھرم رکھیں۔ دولت نہ تھی عزت تھی، راج نہ تھا۔ لاج تھی۔ حکومت نہ تھی غیرت تھی۔ مرگے۔ مگر بات نہ بگڑنے دی۔ دولت مند بہنو! ان کو اپنے نقطہ نظر سے نہ دیکھو تم آٹھ سیر کے آٹے اور آدھ سیر کے گھی میں گن ہو وہ غریب ۲۰ سیر کے آٹے اور ڈیڑھ سیر کے گھی میں بھی مشکل سے پیٹ بھرتے تھے۔ تم پر صبر اپنی ذات کے حقوق ہیں، ان بد نصیبوں پر غیروں کے بھی تھے تم کھا کر مطمئن اور پہن کر خوش ہوتی ہو تو وہ کھلا کر خوش اور پہنا کر ناش ہوتے تھے۔ میں ایسی خوش نصیب نہیں ہوں کہ وہ صورتیں اپنی آنکھ سے دیکھتی۔ مگر ان کے جوہر سننے ہیں اور ان کے کھڑوں کے دیکھنے کو ترستی ہوں کیا تم اس سفید ڈاڑھی کو قابل رحم اور اس پیشانی کو جو گھنٹوں سجدے میں رہی ہے لائق ہمدی نہیں سمجھتیں۔ جس کا منظر میں تم کو دکھائی ہوں ؟

نماز مغرب سے فراغت پا کر بڑے میاں لکڑی ٹیکتے ہوئے پروہ پروسن کے گھر پہنچے اور پوچھا۔

”بیٹی تیل منگو لیا؟“

بیوہ۔ جی نہیں آپ ہی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ننھا بھی بھار
میں لوتھ ہے۔ دھیلے کاتیل اور دھیلے کا شربت بنفشہ لاد دیجئے۔
ایک ہاتھ میں ٹوٹی بوتل، دوسرے میں پچکا کٹورا۔ تیل لائے۔
شربت لائے۔ بیوہ نے کہا۔

”اے ہے انا میں تو بھول گئی ایک پیہ کے اوپر بھی لاد دیجئے۔“

بڑے میاں۔ ”اچھا بیٹا لاد۔“

رات کا وقت سڑک پر اندھیرا، بغل میں بوجھ۔ ٹھوکر کھائی گرسے اور
اٹھے، چاروں طرف ٹٹل کر اوپے سیٹے۔ ایمان زبان سے کہتے ہوئے
لرزتا ہے اور تمہارے نازک دل یہ سن کر کانپ جائیں گے کہ بڑے
میاں نے اس اندھیرے میں اس خیال سے کہ بیوہ کے مال کا قیامت
کے روز مجھ سے مواخذہ نہ ہو ایک ایک کرسی ڈھونڈ ڈھونڈ کر بچنی،
اور لے کر آئے تو بیوہ نے اوپے نیکر کہا ”مکان دار آیا تھا۔ کرایہ کار پوچھ
میرے پاس رکھا ہے میں نے اس وقت بات نہیں کی۔ یہ دیتے جائیے“
بڑے میاں۔ ”تم نے بہت اچھا کیا۔ لاد میں دیدوں گا

جوان عورت کا غیر مرد سے بات کرنا کیسا۔ بیٹی ہم نے ایک دفعہ مولانا
سے یہ سنا تھا کہ کسی موقع پر حضرت ابو بکر رحمہ اور بی بی عائشہ رحمہ
دونوں باپ بیٹیاں باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہ تشریف لے
آئے اور آپ نے اس تنہائی کو پسند نہ فرمایا۔ بھلا خیال تو کرو صدیق
جیسا باپ اور صدیقہ رحمہ جیسی بیٹی کہ بیٹی بھی اور مسلمانوں کی ماں بھی،
جب یہ صورت ہو تو ہم جیسے گنہگار کس گنتی میں۔ بیٹی جہاں دوائی
ہوتے ہیں وہاں تمیر شیطان ضرور ہوتا ہے۔ اور تمہارے حالات کا

تقاضا یہ ہی تھا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اُس سے بات نہ کی اس کو نہ میں
 بیٹھی اشتراک کرتی رہو۔ خدا عزت آبرو سے اٹھالے تو سب کچھ بھریا۔
 میری بہنو! میں تم سے بحث نہیں کرتی۔ میں جانتی ہوں کہ وقت
 تمہارے ساتھ ہے تم جو کچھ بھی کہو گی وہ صحیح اور میں جو کچھ بھی کہوں گی وہ
 غلط۔ مگر تمہارے ایمان پر فیصلہ چھوڑتی ہوں۔ کیا بڑے میاں کی یہ رائے
 غلط تھی کہ عورت کی عصمت پر تمام خاندان کی عزت کا
 انحصار ہے۔ اگر نہیں تھی اور ان کا خیال درست تھا تو کیا وہ یہ کر سکتے
 تھے کہ اپنی جوان بیٹیوں کو کسی ضرورت سے بھی آنکھ سے دور کر دیں؟
 تمہارا دعوئے اب شاید اور بھی مضبوط ہو جائے اور تم کہہ سکو کہ
 عصمت لاشیٰ تھوڑی بھر رہی ہے کیا ڈاکہ پڑ رہا ہے کہ لڑکیوں کو قید کر دو
 بہنوں تم اس کو قید نہ کہو یہ صرف احتیاط تھی اپنے واسطے نہیں لڑکیوں
 کے واسطے کہ وہ ہر بلا سے محفوظ اور ہر آفت سے بچی رہیں۔ میں خود
 کہتی ہوں کہ ڈاکہ نہیں پڑا اور خدا خواستہ تم سے بھی بدظن ہونے کی
 کوئی وجہ نہیں **ظَنُّوا الْمَوْتِیْنَ خَیْرًا مِّمَّا اٰمَنَ** ہے۔ لیکن
 ارکان پر غور کرو آخر تجھلے ہی مہینہ کا واقعہ مشن کا لے لو کس طرح ماں
 باپ چیختے اور پیٹتے پھرے بڑے باپ نے کیا کیا نہ کیا اور اس
 بڑھاپے نے اس کو کیا کیا نہ دکھایا۔ پھوٹی آنکھ کا دیدہ، عمر بھر کی کمائی
 ایک بچی اور وہ آنکھوں کے سامنے غیروں کے چھندے میں چھن جاتا
 بد نصیب باپ پر کیا گندی رہی بتا سکتا ہے۔ مسوں کے آگے ماتہ
 اس نے جوڑے۔ عدالت کے پاؤں میں سر اس نے رکھا۔ بیٹی کی
 منتِ موتِ خدا اس نے کی۔ مگر خاکِ اخر نہ ہوا۔ جوان تھی مکمل کھلا عیسائی

ہوئی اور وہی تھو چار جس کو سارا محمد جانتا تھا عیسائی ہو کر اس کا شوہر
 بلند قاضی اور ملاک پھر ہی اور عدالت کوئی بھی کچھ نہ کر سکا کہ لڑکی اپنی دینی
 کی مختار ہے۔ میں تم ہی سے پوچھتی ہوں کہ اگر ماں باپ مشن میں آزادانہ
 نہ بھیجتے تو یہ دن کیوں دیکھنا نصیب ہوتا۔ تو اس سے تمہیں انکار
 نہیں اور ہو سکتا بھی نہیں کہ مشن سکولوں کی تعلیم میں اندیشے
 کا امکان ہے۔ ایسی حالت میں وہ لوگ بد قسمتی سے چونکہ عصمت
 کو عورت کا سب سے بڑا جوہر سمجھتے تھے۔ انہوں نے موجودہ ذرائع
 تعلیم قابل اطمینان نہ سمجھے جس کا نتیجہ یہ نکالا گیا کہ وہ تعلیم نسواں کے
 مخالف ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں بلکہ اصلیت وہ احتیاط ہے جو
 میں نے بیان کی اب تم کو پھر ایک بات کہنے کا موقع ملتا ہے کہ حصول
 علم اسلام کا مسئلہ فیصلہ ہے۔ جس میں مرد کی تخصیص نہ عورت کی
 انہوں نے محض اپنے وہم پر عورت کی تمام زندگی قربان کر دی
 اور اس کو جاہل رکھ کر قوم کو وہ نقصان پہنچایا۔ جس کی تلافی
 صدیاں بھی مشکل سے کریں گی :

مجھے اعتراض کے پہلے حصہ سے اتفاق ہے اور میں اعتراض
 کرتی ہوں کہ تحصیل علم کی کوشش اسلام کا فیصلہ قطعی ہے۔ مگر
 میں اس کے ساتھ انتناظر رکھوں گی کہ اسی وقت تک اسی حال میں
 اور اسی صورت میں کہ ہمارے مذہب پر آنیچ نہ آئے۔ جب ہمارے
 مذہب پر نوبت آئی تو ہم وہ لوگ ہیں کہ علم کیا تو بہ تو بہ نوز باسبر.....
 خیر میں کچھ اور تو ہمیں کہتی اپنی زندگیوں ملک کو قربان کر دیں
 مسلمانوں نے اگر تعلیم نسواں کو مذہب پر قربان کیا تو کیا گناہ کیا :

دیکھتے تھے کہ مسلمانوں کے اتنے در سے موجود نہیں، اتنی
اُستائیاں میسر نہیں، اتنے انتظام ممکن نہیں، وہ سنتے تھے
کہ مشن کی برصغیر والیاں اذان کے وقت انجیل کے سبق رٹ رہی
ہیں، وہ دیکھتے تھے اور سنتے تھے وہ جانتے تھے ان کو معلوم
تھا کہ موزن کے الفاظ فضا سے ہوا میں گونج رہے ہیں، اور نیند کے
متوالوں کو جگا جگا کر حق کی طرف بلا رہے ہیں، مگر کواری بچیاں
جوان اور ہوشیار تکیہ کے نیچے سے انجیل نکال کر چھپا چھپ حفظ
کر رہی ہیں

وہ جانتے تھے کہ یہ ان مرثیوں کی بچیاں ہیں جن کے کچے
پیغام حق دہلا دیتا تھا کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھتی تھیں۔ اور کڑ کڑاتے سبازوں
میں وضو کر کے سجدوں میں گر گر کر۔۔۔ گر گر کر احکم الحاکمین کی وحدت
کا اعتراف کرتی تھیں :

میری پیچو! کواری بنی کو دلسن بنا کر پانکی میں بشادو۔ وداغ کردو
میت کو تھلا دھلا چار پائی پر لٹا کر رخصت کردو۔ مگر وداغ مذہب
آسان کام نہیں جو لوگ اس کو جدا کر رہے ہیں۔ ان کو معلوم نہ ہو۔
مگر ان کی حالت پر ابھی رونے والی آنکھیں دنیا میں موجود ہیں یہ دو
چیزیں عصمت اور مذہب مسلمانوں کے سامنے تھیں اور ہیں۔ ترازو
کا ایک پلڑا یہ تھا اور دوسرا تعلیم نسواں۔ واقعات تمہارے سامنے
ہیں ترازو اپنے ماتھے میں ہے اور بتا دو کہ کدھر کا پلڑا فانی ہے اور
بڑے میاں کی لکریں :

یہ میں نے منوایا۔ مگر واقعہ جو تم سمجھ رہی ہو وہ نہیں انہوں نے

تعلیم نسوان کو ہرگز نہیں چھوڑا۔ وہ صرف اسی تعلیم کے مخالف نہ تھے جو ان کے اصولوں سے علحدہ تھی وہ پڑھاتے تھے لکھاتے تھے اور بتاتے تھے کہ دنیا میں کیونکر رہنا اور کیا کرنا ہے۔ میری بہنو! ان کا ہر گھر مکتب اور ہر محلہ مدرسہ تھا۔ یہ مبالغہ نہیں ہر پڑھی لکھی عورت کا فرض تھا کہ محلہ کے بچوں کو پڑھا سکے اب وہ سارا نہ رہا۔ مگر اس کے دیکھنے والے موجود ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بغل میں بٹکیہ اور پارے لئے علی الصباح اُستستانی کے یہاں پہنچ گئیں یہ اپنا ہی محلہ اور دیوار پہنچ گھر ہے مائیں آ اور جا رہی ہیں دیکھ اور بھال رہی ہیں۔ کہ تعلیم کیونکر ہو رہی ہے۔ پڑھنا۔ لکھنا۔ سینا پڑنا۔ کھانا۔ پکانا جو آج میسر نہیں آسکتا دماں بانوں باتوں میں حاصل ہوتا تھا۔ تم مشکل سے اور شاید دس پانچ منٹ میں کافذ اور قلم۔ منبل اور سلیٹ پر لکھ کر بتاؤ گی مگر وہ تمہارے سامنے زبانی حساب کر کے بتا دیں گی کہ دو روپے ساڑھے چھ آنے گز کا کپڑا ایک گز ساڑھے سات گزہ کہتے کا ہوا۔ تم کو سوچنا پڑے گا کہ پونے چودہ چھٹانک کا گئی سات پیسے کا لٹنا ہوا۔ مگر وہ چٹکی بجاتے ہی بتا دیں گی۔ اگر تم کو تعجب ہو تو میری نانی اماں بھی ہیں ان کا امتحان لے لو۔

تو بہنو! انہوں نے ہرگز ہرگز تعلیم نسوان کو ہاتھ سے نہ دیا۔ تعلیم دی اور وہ تعلیم جو اسلام کا عین منشا تھا۔ خیالات پہننے نہ دے۔ مذہب کو مقدم رکھ کر ہر ضرورت کو اس کے تحت میں سمجھا اب بھی مسلمان لڑکیوں کو تعلیم دے رہے ہیں اور پہلے بھی دیتے تھے۔ مگر اس طرح کہ مذہب ہاتھ سے نہ جائے مسلمان میسوں کا

وہ فریق یا مردوں کا وہ گروہ جو تعلیم جدید کو مقدم سمجھ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں، کہ زمانہ کی رفتار اس کے ساتھ ہے وہ جو کہے درست، مگر حق یہ ہے کہ ان کو علم صرف اتنا ہی حاصل ہوگا کہ ٹوٹا پھوٹا خط لکھ لیں یا اعلیٰ لباس پہن کر تفریح کر لیں۔ بہت تیر مارا تو کسی شہر کا نام انگریزی میں لکھ لیا۔ مگر یہ جو کچھ اس طریقہ تعلیم سے (رشن سکولوں میں پڑھنے سے) حاصل ہوگا اس زبردست قربانی کے بعد جس کا نام مذہب ہے؟

تقریر ختم کرتے ہی زاہدہ آگے بڑھی ایک کشتی اٹھائی جس میں دو نئے جوڑے اور کچھ روپے تھے۔ رحیم کے پاس آئی اور کہا: ”میں اتو جوڑ کر کہتی ہوں کہ خدا را شاہدہ بد نصیب کا تصور معاف کیجئے۔ یہ صرف آپ کی آواز کا اثر ہے کہ وہ کجست آج تک نہ پہنچی“ رحیم نے زاہدہ کو گلے لگا لیا اور کہا۔

”میں ایک معمولی ماما ہوں اس قابل نہیں کہ آپ مجھ کو اس طرح شرمندہ کریں بچی خدا تیری عمر دراز کرے تیرا گھر آباد تیری ماکا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ چھوٹی بیوی کا نام میرے سامنے نہ لو۔ میری آبرودان کی بدولت غارت ہو چکی۔ اور آج تک میری بچی کو برہنہ جڑا۔ میں جیل خانہ پہنچی اور حوالات میں رہی۔ بیوی اس سے زیادہ مصیبت کیا ہوگی۔ رات کے وقت میری بچی کواری میری آنکھ سے اوچھل ہوئی۔ میں اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ وہ طاقتور ہیں۔ امیر ہیں پڑھی لکھی ہیں۔ میں بچاری کمزور ہوں۔ غریب ہوں۔ بدے کے لائق نہیں۔ مگر جس کے آگے پانچ وقت سر جھکاؤ ہوں وہ شاہدہ بیوی سے زیادہ طاقتور ہے۔ میرا بدلہ ضرور ملے گا“

اتنا کہ رحیم کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ کھڑی ہو گئی

ہر چند سب نے روکا۔ مگر اس کی حالت ایسی خراب ہوئی کہ وہ نہ ٹھیری اور چل دی۔
 شام کے وقت ہمان اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ دوسرے روز صبح کے
 وقت جب زاہدہ میاں کو کھانا کھلا چکی تو پندرہ روپے دے اور کہا
 ”آج ہی دو لہن بیگم کو روانہ کر دو“

احسان ”ہیں۔ ہرگز نہیں“

زاہدہ ”نہیں یہ فیصلہ غلط ہے۔ وہ نکاح میں ہیں اور ان کی خبر گیری تمہارا
 فرض۔ دنیا کے دھندے چل رہے ہیں چلے جائیں گے۔ مگر خدا کے ہاں بوجھ اپنے سر پر
 نہ رکھو“

احسان بیوی کی انسانیت کا سترف پہاڑ پر ہو چکا تھا۔ یہاں پہنچ کر جب یہ
 دیکھا کہ زاہدہ ملازمت سے زیادہ بیکاری میں فرما نبرداری نکلی تو اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔
 اس وقت زاہدہ نے یہ تقریر کی تو ان تمام مظالم کی تصویر جو احسان نے پہاڑ پر توڑے
 آنکھ کے سامنے پھر گئی۔ اور اُس نے سوچا کہ انتہائے انسانیت ہے اور صرف
جوہر قدامت کہ جس شقی القلب عورت کے ہاتھوں اس غریب پر یہ کچھ گزر گئی جو
 بتی۔ مکار ٹھیری۔ گھر چھوڑا۔ بار چھوڑا اس وقت بھی اس کی سفارش کر رہی ہے۔ یہ خیال
 آتے ہی بے ساختہ احسان چیخ اُٹھا کہ ”بیک زندگی تم ہی جیسی بیویوں سے سنو سکتی ہے
 جنہوں نے انسانی ہمنیت میں شوہروں کو جنت کا نمونہ دکھایا“

احسان کی حالت کا انقلاب عارضی تھا جو بیوی نے چند ہی روز میں درست
 کر دیا اور وہ شخص جو پہاڑ پر صرف دنیا ہی کو زندگی سمجھتا تھا بیوی کے طفیل اتنا دین دار
 ہوا کہ گھر سے دفتر تک جاتا تو درود شریف پڑھتا ہوا۔ دل میں خلوص اور نیت نیک
 تھی۔ خدا کی رحمت نازل ہوئی اور ایک دو ہی سال کے عرصہ میں احسان دو سو
 روپے ماہوار پر پہنچ گیا +

چوبیسواں باب

سننا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ حسن جیسا عاشق زار شوہر اور غمخوار رفیق جو قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتا۔ شاید وہ سے ایسا بیزار ہو کہ صورت زہر معلوم ہوئے گی۔ بچہ جو آنکھوں کا تارا اور کلیجے کا لکڑا تھا غیروں کی مانند الگ تھلک رہتا اور دشمنوں کی طرح گھورتا۔ باپ جو صورت کا عاشق اور نام کا دیوانہ تھا حسینوں آکر نہ جھانپتا۔ حسن شروع شروع تو بیوی سے در قدم آگے ہی تھا اور اگر وہ ترقی کی دلداد نہ تھی تو یہ پردے کا دشمن مکر واقعات نے بتا اور حالات نے سمجھا دیا کہ یہ جدت کا دور دیکھنے میں شہد۔ مگر اندر سے زہر ہلاہل ہے طبیعت ہٹھی، خیال پلٹا، راستے بدلی، ادھر جہنم کا تواساں اور سانی دونوں کی زندگیاں جنت تھیں۔ برکت تھی۔ پتہ لگ اور سرائع بن گیا۔ نہ قدامت کہنے کو جہالت اگر حقیقت امرت ہے۔ اور یہ ترقی کے نعرے دیکھنے میں پیار سے ہوں مگر آگ کے شرار سے ہیں۔ ترقی اگر ممکن ہے تو صرف مذہب کے ساتھ اور مذہب ان جاہلوں کا مجھ سے بڑے لکھوں سے بدیں اعتبار بہتر کر لے گا تو غریبوں میں، رہے گا تو مفلسوں میں اور ختم ہو گا تو ان ہی بیچاروں پر

خدا کی قدرت تھی کہ وہی حسن جو ترقی کے نعرے لگاتا چادوں طرٹ پھرتا تھا جس کی تحریر اور تقریر جس کا گھر اور بار جس کی بیوی اور بچے جذت کا مکمل وعظ تھے جس کی زبان سے اظہم کے سوا کبھی خدا کا نام نہ نکلا اس خشوع اور خضوع سے نماز پڑھنا کہ دیکھنے والے تعجب کرتے۔ شاید اس کی نماز پر اس کی دعا پڑھتی۔ مسکراتی تعجب کرتی۔ وہ دل ہی دل میں دانت پیتا تو ری چڑھاتا۔ دیکھتا جو ہوتا اور سنتا جو کہا جاتا۔ مگر زبان سے ایک حرف نہ کہتا۔ اتفاق دیکھو کہ کلب کا ہوا سالانہ جلسہ، دور دور سے آئیں عزیزین و محواں و عار ہوئیں تقریریں۔ اور صدر جلسہ نے اپنی چھپی ہوئی تقریریں

طرح علی الاعلان پڑھی۔

سہارا جہالت کا زمانہ ختم ہوا ہم ہیں جو چند پرانی عورتیں زندہ ہیں وہ
چند روز کی مہمان ہیں۔ یہ شیت مسلمان مرنے کے ہمارا فرض ہے
کہ وہ دستکش کریں جو ہماری لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنا دے

اتفاق کی بات ہے کہ بہن کے سید اصرار سے اس جلسہ میں زادہ بھی چلی گئی تھی
اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ اس کا پہلا اتفاق تھا ورنہ وہ کہاں اور اس قسم کے
جلسے کہاں۔ سر منڈاتے ہی اوپے پڑے۔ پہلی ہی شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے
زحمت کے کلفت ہوئی۔ تقریر سننے ہی بدن میں آگ لگ گئی۔ بھری بھی تھی۔ کہ گیدڑ
کی شامت آئی اور شہر کی طرف رخ کیا۔ شاہدہ جو اس وقت پورے زوروں پر تھیں اور ایک
سے ایک بڑے چڑھے حمایتی موجود تھے۔ بہن سے کہنے لگی
”آپ کیوں خاموش ہو گئیں۔ کچھ فرمانا ہے تو فرمائیے۔“

صدر جلسہ۔ ”ہاں ضرور ضرور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے زیر خیالات

سے استفادہ ہوں“

دوسری لڑکیاں۔ ”میشک بیشک محترمہ ضرور ارشاد ہوا آپ کی بہت

تعریف سنی ہے“

شاہدہ۔ ”آپ سب بیویاں خاموش ہو جائیں۔ میری ہمیشہ محترمہ مسز

احسان کچھ فرمانا چاہتی ہیں“

بیویاں خاموش ہو گئیں اور سب کی شرانگیزی زاہدہ کھڑی ہوئی اور کہا۔

”بہنو! مجھے آئی آپ کے جلسہ میں شریک ہو کر خوشی بھی ہوئی

لکھنؤ بھی۔ خوشی اس بات کی کہ بہنوں میں اپنی حالت کی بہتری کا سامنا

شروع ہے اور اُمید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بہت کچھ ترقی کریں گی اور افسوس اس امر کا کہ جہاں صدر جلسہ کی تہذیب یہ ہو کہ تانیوں اور دادیوں کو جاہل کہنے میں بھی ہاک نہ ہو دماں حاضرین تو با و آدام اور اماں خوا کجو کچھ بھی نہ کہیں وہ تھوڑا۔

میں اس وقت کسی تقریر کے واسطے تیار نہیں ہوں اور اس لئے اراکین جلسہ کی طرح میرے پاس کوئی لکھی ہوئی تقریر موجود نہیں جو میں طوطے کی طرح رٹ کر آپ کے روہو پڑھ دوں۔ میں صدر جلسہ صاحبہ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں :

بڑی بدعصیوں کو جاہل کہہ دینا صرف زبان کا ایک سکند کا کام ہے اس میں ہمدی لگتی ہے نہ پھٹکری۔ جو لوگ خدا کے منکر ہیں ان کو بھی یہ کہنے میں کہ خدا کوئی نہیں کچھ زیادہ سامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صدر صاحبہ نے نہایت اطمینان سے پودانی عورتوں کو جہلا میں شامل کر دیا میں اسے پہلے بھی یہ لغو جملہ بعض بڑکیوں سے سن چکی ہوں۔ مگر بحث یہ ہے کہ کیا زبان سے کسی کو کچھ کہہ دینا کافی ہو سکتا ہے۔ اگر میں اس وقت یہ کہوں کہ میں عورت نہیں مرد ہوں تو کیا یہ میرا کہنا صحیح ہوگا؟

ضرورت ہے کہ ہر دعوے کے ساتھ ثبوت ہو۔ زیادہ سے زیادہ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہالت کا ثبوت اسے زیادہ کیا ہوگا کہ ان کے عقیدے درست نہ تھے، وہ تعویذ لگتے تھے تو ان کے عقیدوں وغیرہ کی قایل تھیں، وہی تھیں، بہت سی کمزور باتیں ان کے تمدن میں شامل تھیں۔ مگر میں کہتی ہوں یہ صحیح نہیں

مجھے اس سے انکار نہیں کہ وہ وہی تھیں۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کے بعض عقیدے کمزور تھے۔ مثلاً ان کو وہم تھا کہ سیتلا جس بچہ کو نکل رہی ہو۔ اس کے پاس دھوبن نہ آئے یا زچہ کے پاس دھوبن نہ آئے کے در نہ بہت بُرا ہوگا۔

یہ یا اس قسم کی اور باتیں ہیں جو نبوت میں پیش ہو سکتی ہیں۔ مگر کیسے افسوس کی بات ہے کہ دیدہ دانستہ جان بوجھ کر انصاف کی آنکھوں پر مٹ دھری کی پٹی باندھی جاتی ہے۔ پھولوں کو کانٹے اور موتیوں کو پتھر ثابت کیا جا رہے کیا کوئی ذی عقل اس سے انکار کر سکتا ہے کہ مانتا کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی شے وقعت رکھتی ہے۔ ایک بچہ کو چپک نکل رہی ہے۔ ماں زرات دن اس کو گود میں لئے رہتی ہے۔ اگر اس کو یہ یقین دلایا گیا کہ دھوبن کا آنا بچہ کے واسطے مضر ہے تو وہ زبردست احتیاط اور روک تھام کی لگی جس کا عشرِ عنبر بھی آج نہیں ہوتا۔ بچہ چپک میں ہے۔ ماں معمولی مرض میں گرفتار نہیں۔ مرض متعدی ہے اور بہت ممکن ہے کہ ماں پر بھی اثر ہو گیا ہو۔ قوی شبہ ہے کہ گھر کے کپڑوں میں اثر موجود ہو۔ اگر یہ کپڑے دھوبن کو دیدے گئے اور اس ذریعہ سے جراثیم ان تمام کپڑوں میں پہنچ گئے جو دم بون کے ماں موجود ہیں تو تمام شہر اسی مرض میں گرفتار ہو جائے گا۔ بتاؤ یہ جہالت ہے یا علیت کیسی اچھی طرح ایک بات بتاؤ۔ ان کے ذہن میں تو یہ باتیں بطور عقیدہ کے ہوتی تھیں مگر ان تمام باتوں کی اصلیت۔ غور کرو تو اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔

یہ ہی کیفیت زچہ اور بچہ کی ہے۔ دھوبن کے یہاں کسی ایسے دیے گھر سے کپڑے آئے جہاں مرض متعدی ہے تو اس کو زچہ بچہ کے پاس

نہ آنا چاہتے۔ بچہ نازک ہے اور بہت جلد اثر قبول کر لے گا۔ جس بات کو
 تمہارا جی چاہے لے لو، جہالت نہیں پوری علمیت ثابت ہوگی اور جن
 علوم کا تم نے فقط نام ہی سنا ہے وہ اس طرح ان سے ماہر مہرتی تھیں
 تم کہتی ہوگی کہ یہ باتیں ان کی گھٹی میں اس طرح بڑ گئی تھیں کہ وہ اس کی
 اصلیت کو بلا سوچے سمجھے پتھر کی گبر سمجھتی تھیں۔ تمہارا یہ کہنا غلط ہوگا۔
 معمولی عورتوں کی تو کہتی نہیں۔ مگر شریف خاندان کی خواتین ان گروں سے
 اچھی طرح آشنا تھیں۔ رہے گنڈے تو یہ اس کا مجھے اعتراف ہے
 کہ یہ رغبت ان میں نسبتاً زیادہ تھی۔ لیکن اس کو میں جاہلیت سے
 منسوب نہیں کر سکتی اور یہ کہوں گی کہ دنیا سے ناپائدار خدا کے خاص بندوں
 سے کبھی خالی نہ رہی اور تاریخ مسلمانوں میں ان پاک نفوس کا وجود ثابت
 کر رہی ہے جن سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ ان کی التجاؤں کا بارگاہِ صریح
 میں قبول ہونا زیادہ ممکن ہے یہ اسی ہے وہ رجوع جس کو تم گنڈے توہیدوں
 سے تعبیر کرو۔ مگر یہ سن لو کہ زمانہ کی موجودہ ترقی کے ساتھ ہی ایسے لوگوں
 کی تعداد بھی بڑھی جو حقیقت کچھ نہ تھے۔ مگر وہ دنیا کے سامنے اس لباس
 میں جلوہ گر ہوئے۔ اس دورِ جدید کے ایک اعتراض کا جواب میرے
 پاس نہیں کہ مذہب اسی جہالت ہے یہ آپ زبان سے نہ فرمائیں مگر واقعات
 آپ کے اس خیال کی تائید کر رہے ہیں۔ اگر مذہب کا نام جہالت ہے تو
 یہ جہالت ان میں ضرور موجود تھی۔ غالباً ترقی سے آپ کا مقصود یہ ہی
 ہے کہ جہالت یعنی مذہب بتدریج کم ہو اس میں آپ کو ضرور کامیابی
 ہوئی اور مذہب کی عظمت روز بروز گھروں سے اُتر رہی ہے جاہلوں کا
 یقین یہ تھا کہ جس گھر میں بارہ برس کی بچی بے نمازن ہو رہاں رحمت

کے فرشتے نہیں آتے۔

اگر صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہو کلام اللہ پڑھا جائے تو دن ہنسی
غوشی سے گزرتا ہے۔

رات کو سونے وقت بچھوڑوں میں لیٹ کر کلام اللہ پڑھ کر مردوں کو
پہنچاؤ کہ ان کو ثواب ملے اور عذاب میں تخفیف ہو۔

دستر خوان سے اگر کسی غریب کین کو کھانا چلا گیا تو کھانے کا حساب نہ ہوگا
و عطا اور ذکر و ولادت گھر میں اکثر ہونا چاہیے۔

”بارہ برس سے کم کے بچے اگر بغیر نماز یاد کئے مرن گئے تو ان کا عذاب ماں
باپ پر ہوگا“

رات کو سونے وقت آیت الکرسی پڑھ کر سوؤ تو ہر قسم کے ڈر اور خوف
سے محفوظ رہو گے،

شیطان کو سب سے زیادہ اذیت معصوم بچوں کے سجدے سے ہوتی ہے
کو ارمی لڑکیوں کو جوان لڑکوں سے ہنسکرات نہ کرنی چاہیے۔

سفید بالوں کا ادب کرو ان کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔

بڑا نوالہ کھاؤ۔ بڑا بول نہ بولو۔ یعنی غرور نہ کرو۔

بچہ کو گود میں اٹھاؤ تو بسم اللہ کہہ کر تاکہ یہ آواز اس کے کانوں میں پڑے
ورد و شریف پڑھنے سے گھر میں برکت ہوتی ہے۔

غائب جہالت سے آپ کا مقصد یہ عقاید ہیں۔ اور مجھ کو یہ حق حاصل ہے

کہ میں آپ کو مبارکباد دوں کہ آپ کی کوشش کامیاب ہوئی اور یہ جہالت

اب بہت کم ہو گئی۔ یہ آوازیں اب سلمان بہت کم سنتے ہیں۔ جاہل بیویا

کے عقاید کا انحصار اس شخص کے الفاظ اور ارشاد پر تھا جو خاک سرست

آٹھ گز تمام روئے زمین پر ڈنکا بجا گیا اور فرمایا جو مخلوق کے نزدیک اچھا ہے وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا اور جو مخلوق سے بُرا ہے وہ خدا سے بھی بُرا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ مرنے کے بعد جن لوگوں سے زندگی میں سابقہ پڑا ہے وہ ان کی موت پر روئیں۔ مجھے معاف کرنا اگر میں کہوں کہ تعلیم یافتہ بیروں کے کارنامے ان کی زندگی میں اخباروں اور رسالوں میں چھپنے کو تو واقعی ہیں۔ لیکن ان کو رونے والے غیروں میں کیا ایہوں میں اسلئے کہ ان کے وجود سے حقیقی مسرت کسی متنفس کو نہیں پہنچی۔ مجھ کو اپنی بڑی نانی اما یاد ہیں۔ میں دس سال کی تھی اور جو منظر اس وقت میری آنکھوں نے دیکھا آخر بھر یاد رکھو گی رات کو تین بجے انہوں نے انتقال کیا اور صبح تک یہ خبر تمام شہر میں مشہور ہو گئی۔ جنازہ صحن میں رکھا تھا کہ محلہ کی غریب عورتیں لپٹ لپٹ کر چغیر مارنے لگیں۔ یتیم بچے چار پائی سے لپٹ گئے دراندیش قبرستان تک بچھاڑیں کھاتی ساتھ تھیں۔ میں بچہ تھی۔ سمجھ نہ سکی بعد میں معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کی تنخواہ مقرر نہ تھی کسی کا کپڑا کسی کا کھانا، وہ جاہل تھیں مگر ایسی جاہل کہ آج ان کے شاگرد شہر میں ایسے جدید حافظ موجود ہیں جو ہر سال تراویح میں ان کی جہالت کے کارنامے بلند کر رہے ہیں۔

شاہدہ نے تو بہن کو زک دینے کا ایک موقعہ بنا کا تھا۔ مگر اتنی مانگیں گلے میں گئیں ناہدہ کی تقریر سے مجلس میں ایک سناٹا چھا گیا۔ دیکھنے میں تو سب خاموش تھے مگر بعض دل میں نہال اور لعین بھرتہ۔

پچیسواں باب

اب حسن کی زندگی عجیب زندگی تھی وقت کا بڑا حصہ علماء کی صحبت اور مذہب کی خدمت

میں بسر ہوتا کرکڑا آئے جاٹوں کی ان راتوں میں جب مائیں شاہدہ کے سر ہانے اور پانستی دہکتی ہوئی انگلیٹھیاں روشن کرتیں وہ چار سبکے اٹھ کر مسجد میں آتا اور اپنے ہاتھ سے نمازیوں کے وضو کا پانی گرم کرتا آدمی خوش الحان تھا صبح کی اذان اس جوش و خروش سے دیتا کہ سننے والے تھک جاتے۔

اندیشہ تو یہ تھا کہ شاہدہ کے رکے شاہدہ کا ماں کے پاس رہ کر اور اس کی ہنٹنی پر پڑاٹھ کر ناس ہوگا اور وہ باپ کو غنڈہ خانہ اس بچے گا۔ مگر وہ مذہب کے اعتبار سے اس وقت کا دوسرا باپ تھا تعجب ہوتا اور خدا کی قدرت بآتی تھی کہ جس ماں نے سوا کلب کے کبھی گھر پر خدا کا نام نہ لیا اس کا بچہ اور گلوڑے کی کچھ بساط بھی تو نہیں۔ بارہ برس کی جان اور ایسا مسلمان کہ جیٹھ بیا کھ کے روزے رکھے !

شاہدہ یہ تو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میاں اور بڑا کا دونوں میرے دھنوں سے خوش نہیں۔ مگر وہ دونوں کو جاہل اور بے وقوف جان رہی تھی۔ سچ پوچھو تو اس کے دامن پر ایک ایسا دعبہ تھا کہ وہ بات تک کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ مگر خدا بے غیری کا بھلا کرے کبھی آنکھ بھیپی نہ دل نادم ہوا۔ اکڑتی اسی طرح اور پھلتی اس سے زیادہ، ہماری رائے میں تو بد نصیب کی بربادی کا سارا بار باپ کی گردن پر ہے۔ یہ صحیح کہ وہ خود راہ راست پر آچکا تھا۔ مگر جو بیچ بودے تھے۔ اس کے پھل کیونکر غارت ہو جاتے خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں شاہدہ کی لائڈ مہی حسن اور شاہدہ دونوں کے واسطے تازیانہ ہوئی اور دونوں نے مصمم قصد کیا کہ اپنی زندگی کے واسطے وقف کر دیں اور دنیا کو دکھ دیں کہ تعلیم نسواں کیا چیز ہے۔ حسن کے پاس روپے کی کمی نہ تھی اس نے بسم اللہ کہہ کر مدرسہ کھول دیا۔ اور تعلیم شروع کر دی۔ مسلمان استانیوں کا ملنا مکمل تھا جو میسر آ گئیں ان کو سر آنکھوں پر رکھا اور جو کمی رہی حسن نے اپنی ذات سے پوری کی۔ انتظام یہ تھا کہ چھ برس سے دس برس تک لڑکیاں داخل ہو سکیں جن

ان بچیوں کو خود پڑھاتا۔ لکھاتا۔ مذہبی تعلیم ہر لڑکی کے واسطے لازمی تھی اور باقی والدین کی خوشی پر منحصر۔ مدرسہ کا شوق ایسا ہوا کہ حسن بیوی بچے گھر بار سب بھول گیا۔ دن رات وہ تھا اور مدرسہ تھا۔ چند روز میں مدرسہ اس قدر ترقی کر گیا کہ دور دور سے لڑکیاں آئیں اور داخل ہوئیں چار سال کے بعد جو لڑکیاں کامیاب ہو کر نکلیں وہ قوم کا مول تھیں۔ علوم جدیدہ کی مہارت کے ساتھ مذہب ان کی رگ رگ میں پیوست تھا اندک اتمام کام حسن کے سپرد تھا۔ انتظام شاہد کے۔ حسن کی نیت پاک اور کوشش صاف تھی۔ خدا نے برکت دی اور حسن نے دکھا دیا کہ مذہب نظر انداز نہ ہو تو تعلیم نسواں اسلام کا جزو اعظم ہے۔

شاہد اب باپ کا برابر کا بازو کامیابی کا راز اور اس کے تمام مقاصد کی جان تھا۔ اپنی تعلیم سے فائز ہو کر جو وقت بچتا سب باپ کی کوششوں میں صرف کرتا۔ مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا۔ جاڑوں کا موسم۔ صبح نماز کے وقت اٹھ کر نہایا نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھا مدرسہ گیا۔ آیا کام کاج کرتا اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف تھا کہ گردہ میں کسک معلوم ہوئی۔ دو پہر تک ٹالتا اور پھرتا رہا۔ مگر نظر کے بعد تو مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا ایک چیخ آسمان تھی اور ایک زمین شاہدہ بیٹے سے منفرد اور بیٹا اس سے بیزار۔ مگر ماتھی سنتے ہی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ گھبرا کر اٹھی اور بیتاب ہو کر آئی۔ دیکھتی ہے تو بچہ کا رنگ سفید پڑا ہے سناٹے میں رہ گئی۔ ڈاکٹر حکیم ملاز آ اور جا رہے تھے۔ نسخہ پر نسخہ اور لیپ پر لیپ بدلا جا رہا تھا۔ مگر درد تھا کہ کسی عذاب کم نہ ہوتا تھا۔ درد بچہ کے گردہ میں تھا اور ماں کا کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ اس کے منہ پر منہ رکھتی تھی۔ اس کی کمر کپڑی تھی۔ شاہد کی تکلیف جسمانی تھی اور شاہدہ کی روحانی۔ مگر شاہدہ کی اذیت بچہ سے کم نہ تھی۔ اس کی ہر جنبش اور ہر آہ کے ساتھ بے چین ہوتی۔ روتی بلکتی اور جس وقت کہتا۔

”مائے اماں جان کیا کروں“

تو گلے میں ماتہ ڈال کر لپٹ جاتی۔ دن یوں ہی اور رات ساری اسی کرب و
اضطراب میں بسر ہو گئی۔ شہر بھر کے علاج اور دنیا بھر کے جتن کر ڈالے۔ مگر دروین فرق نہ پڑا
مجبور ڈاکٹر نے نیند کی دوا دی تو ذرا آنکھ لگ گئی۔ شاہدہ کروت میں بیٹھی ٹلکنی باندھے بچے
صورت دیکھ رہی تھی اور حسن الگ خاموش بیٹھا تھا۔ حسن کا حال جو کچھ بھی ہو۔ مگر شاہدہ کی کیفیت
تو یہ تھی کہ دل اُٹا آتا اور کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ اس کی موت کا خیال ایک بجلی تھی جو سر سے پاؤں
تک ایک عجیب حالت پیدا کر دیتی تھی۔ چونک پڑتی تھی اور آہستہ سے اس کے منہ پر ماتہ پھیر کر
ٹھنڈا سانس بھر لیتی تھی۔ شاہدہ ان ہی خیالات میں منہمک اور ادکار میں مستغرق تھی کہ مسجد
سے صدائے توحید بلند ہوئی اور موزن کی آذان نے رات کی خاموشی کا سلسلہ توڑا۔ چاند
مدھم مدھم آواز سے پھیکے پڑ کر حیات انسانی کی بے ثباتی کا درس دے رہے تھے۔ آذان سننے
ہی حسن یہ کہہ اُٹھا۔

”حق نام تیرا“

شمیع کی جی سانس جھللا رہی تھی کہ شاہدہ کی نظر پڑی اور اس نے دل میں سوچا یہ
ہی کیفیت انسانی زندگی کی ہے۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کی ہر طاقت فانی۔ باقی رہنے والی ہے
تو وہی ایک ذات۔ اس کا دل میں خیال آتا تھا کہ بچہ کی موت کا یقین بھر آنکھ کے سامنے
آیا۔ بلبلا اُٹھی۔ یہ پہلا روز بلکہ پہلا اتفاق تھا کہ شاہدہ نے زبردست طاقت کا اعتراف
کیا اور فوراً قصد کیا کہ عاجزی کا سر اس کے حضور میں جھکا کر بچہ کی سلامتی کے واسطے
التجا کروں، اُٹھی، وضو کیا، نماز کو کھڑی ہوتی تھی اور اگر نماز ہو جاتی تو یہ پہلا سجدہ تھا
جو ایک فرنٹ عورت کی طرف سے خدا کے حضور میں ہوتا۔ مگر بچہ کی اس آواز نے
”مائے اماں میری جان مکھی“ پریشان کر دیا ورڈی اور یہ کہہ کر آئی۔

”میں اپنے بچہ کے قربان“

یہوش بچہ کا سر ہاکی گود میں تھا۔ جھجھوڑتی تھی۔ جگاتی تھی۔ چلاتی تھی۔ مگر ہر کوشش بے سود اور بیکار تھی کہ شاہد مامی گود میں ایک لگی سی سبکی لیکر ختم ہو گیا۔

چھٹیواں باب

زاہدہ کو شملہ سے آئے پورا سال بھی نہ ہوا تھا اور احسان کی ملازمت کو ساتواں یا آٹھواں مہینہ ہو گا کہ ایک روز خلاف معمول دو بچے احسان متفکر و مغموم دفتر سے آکر اپنے کمرہ میں خاموش بیٹھ گیا۔ زاہدہ اسکے اس طرح بے وقت اور چپ چاپ آنے سے پریشان ہو گئی اور پوچھا،

”خیر ہے اس وقت کیسے آئے؟ جی تو اچھا ہے؟“

احسان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ بیوی کی صورت دیکھ کر دل بھر آیا مگر ضبط کیا اور کہنے لگا۔

”خیریت کیا ہے، جو کیا اسکی سزا بھگت رہا ہوں، دیکھئے کب تک بھگتنی پڑتی ہے؟“

زاہدہ۔ ”آخر بتاؤ تو سہی کیا ہوا، کیا کام میں کوئی غلطی ہو گئی؟“

احسان۔ ”ہمیں کام میں تو غلطی نہیں ہوئی، ہاں زندگی کی غلطی کی سزا

مل گئی،

زاہدہ۔ ”صاف صاف بتاؤ کیا ہوا؟“

احسان۔ ”کیا بتاؤں اور کس منہ سے بتاؤں آج افسر نے ہمارے سخت

سست کہا اور موقوف کر دیا۔ اس کمبخت نے جو دلہن کی حیثیت سے آئی تھی اور جس سے

نکاح کرنا زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے مگر کا دعویٰ کر دیا۔ کل مقدمہ ہے۔ خسر صاحب

تشریف لائے تھے۔ نہ معلوم صاحب کے کان میں کیا بھرا کہ نوکری بھی گئی، رسوائی بھی

ہوئی۔ میں جب باہر نکلا ہوں تو وہ خود بھی برقع اور سہ باپ کے ساتھ بڑکے نیچے کھڑی تھی۔ ایسی خلافت ہندیب باتیں کی ہیں کہ زبان سے نہیں اُٹ سکتا میں نے سب باتوں کا جواب دیا۔ والد صاحب کھڑے سٹے اور ہنستے رہے۔ بیجا آخر میں کیا کہتی تھی۔ ”اب میں تمہارے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔ جس قدر جلد کن ہو مجھ سے قطع تعلق کرو اگر تم کہو گے تو میں مہر میں سے کچھ حصہ چھوڑ دوں گی۔“

زاہدہ ”تشویش کی بات تو ضرور ہے لیکن خدا پر بھروسہ کرو، وہی ہر مشکل آسان کرتا ہے“

آج دن کا باقی حصہ اور ساری رات گھر بھر میں پریشانی کی آندی، علی الصباح زاہدہ ڈولی کر ایک لڑکے کو ساتھ لے ہوٹل میں پہنچی تو بیگم صاحبہ نے اندازے کی اجازت دی۔ مشنری کی صحبت یافتہ مہذب بیوی اور اُن کے والد ماجد کے متفقہ تہنہ نے زاہدہ کا استقبال کیا اور جب زاہدہ نے لڑکے سے یہ کہلویا کہ اگر آپ کے والد صاحب اجازت دیں تو چند لمحہ تنہائی میں گفتگو کرنی چاہتی ہوں، تو اس کا یہ جواب ملا ”ایسی کیا تخلیہ کی بات ہے، تمہارے شوہر نے جو غادی اس کا ثمرہ اس کو بھگتنا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ تمہاری وجہ سے اپنے والد کو باہر جانے کی تکلیف دوں۔ تم ہی جیسی جاہل کندہ ناتراش عورتوں نے عورت کے نام کو بڑھ لگایا۔ احسان یقیناً سزا کا مستحق ہے اور میں ہرگز دگدگ نہ کروں گی“

زاہدہ ”وہ آپ کے شوہر ہیں ایسے الفاظ استعمال نہ کیجئے۔ اگر اُن سے کوئی غلطی ہوئی تو زیادہ خیال نہ کیجئے، وہ اور آپ ہمیشہ خوش رہے ہیں ان کی اور آپ کی دونوں کی ہر ممکن خدمت کو حاضر ہوں“

سوکن ”تمہاری جہالت افسوسناک ہے! تم میرے سامنے ایسے فریبی انسان کا نام مت لو۔ وہ میرا قوم نہیں ہے۔ ایسے دغا باز کو میرا شوہر کہنا میری

اپنے شوہروں کے ساتھ سلوک کریں تو چند ہی روز میں مردوں کی بیویوں کا خاتمہ ہو جائے خوشی کی بات ہے کہ دفا باز احسان اس وقت اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے اور جیلخانہ کی چار دیواری میں سسڑ رہا ہے۔

تقریر ختم ہوئی تو سامنے کے کونہ سے ایک برقع پوش عورت اُٹھی۔ اس کے کپڑے میلے تھے اور بال پریشان۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا ”اجازت ہو تو چند منٹ میں بھی کچھ کہوں؟“ بیویاں اسکا منہ تکتی رہیں۔ اور ایک نے کہا ”فرمائیے۔“

تو زائدہ نے کہا۔

”آپ جیسی محترم خواتین لاریب مسلمان عورتوں کے واسطے قابلِ عزت ہیں اور نہایت مبارک ہو گا وہ وقت جب مسلمان عورتیں مردوں کی ناجائز گرفت سے آزاد ہو کر وہ حقوق حاصل کریں گی جو مذہب مقدس نے ان کو عطا فرمائے۔ مگر کیا آپ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیں گی کہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا اور جو زندگی آپ بسر فرما رہی ہیں یہ اسلام اور مسلمانوں کی واسطے کس حد تک قابلِ فخر ہے۔ اس سوال کا جواب عنایت فرما کر ممنون کیجئے کہ کیا اسلام اس کا نام ہے کہ شوہر بیوی کے ہاتھوں جیل خانہ پہنچے؟ میری نہایت محترم بہن کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کو کیا یہ علم نہ تھا کہ آپ جس شخص سے نکاح کر رہی ہیں یہ دوسری بیوی کا شوہر بھی ہے؟ کیا آپ کا اسلام یہ ہی تھا کہ اپنی ایک بہن کے تمام حقوق پامال فرما دیجئے؟ اگر نکاح ثانی اس کا شرعی حق تھا تو شکایت کیسی؟ اور نہ تھا تو آپ اس کی مرتکب کیوں ہوئیں؟ کیا خرافات کا تقاضا یہ ہی ہے کہ کل آپ جس کی بیوی تھیں وہ آپ کے ہر معیول کی بدولت آج جیل خانہ جائے اور آپ خوش ہوں؟ کیا انسانیت کے یہی معنی ہیں کہ جب تک اسکو

دوسری بیوی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا قسم تھا آپ اس کی تھیں اور جب اُس نے آپ کی ایک بہن کو آپ کی ایک جنس اور اپنی بیوی کے حقوق پر توجہ کی تو آپ اس کی دشمن ہو گئیں؟

بیوی اس بد بخت قیدی کی منکوحہ میں ہوں اور جیسا کہ میں کر چکی ہوں اب بھی اس کے واسطے آمادہ ہوں کہ میں اور میرے بچے آپ کی خدمت میں لونڈی غلاموں کی طرح بسر کر دیں گے۔ آپ غور فرمائیے کہ میں نے یہاں سے ہر اد آپ کو نصرت تنخواہ روانہ کی اور جو کچھ خدا نے دیا اس میں آپ کے حقوق کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن برخلاف اس کے آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا پیار کے آسان دزمین، مکان کے در و دیوار اور محلہ کے مرد و عورت اس کے شاہد ہیں۔ آپ کو وہ وقت یاد ہو گا جب میں بے گناہ آپ کے حکم سے نکالی گئی اور آپ نے مجھ پر چوری کا الزام اٹھا کر روکا۔ زیور کی پوٹلی میرے صندوق سے نکلی اور سینکڑوں عورتوں مردوں نے میرا تماشا دیکھا! میں نے اس وقت بھی جب میری آبرو خاک میں ملی صبر کیا اور آج بھی تمہاری شکر گزار ہوں۔ آپ کے مہر میں یہ میرا زیور حاضر ہے قبول فرمائیے اور بد نصیب شوہر کو قید سے رہائی دلوائیے

یہ کہہ کر زاہدہ نے سب بیویوں کے ساتے زیور کی صندوقچی رکھ دی تو مہر جامِ حیا کے نعرہ سے کمرہ گونج اٹھا۔ زاہدہ کی آنکھ سے آنسو جاری تھے اور قریب قریب تمام عورتیں سو کن پر لٹن طعن کرنے میں اس کی ہمنوا تھیں۔ اسی وقت باضابطہ رسید جہر کی لکھوائی گئی اور اس طرح احسان کو صبح ہی جیل خانہ سے رہائی ملی۔

احسان کے وہ افسر جنہوں نے اس کو موقوف کیا تھا ان کی بیوی بھی جلسہ میں موجود تھیں انہوں نے مفصل حال ڈپٹی صاحب سے کہا اور احسان دوبارہ ملازم ہو کر زاہدہ

کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔

اٹھائیسواں باب

شاہد کی موت کا صدمہ ایسا نہ تھا کہ حسن آسانی سے برداشت کر لیتا لاکھ بھلنے کی کوشش کرتا۔ مگر دل اندر سے بیٹھا جاتا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ ہر وقت وہ تنہا اور قبرستان۔ نیند بھوک اڑ گئی۔ بچے کے نعم میں بچوں کی طرح روتا۔ ایک ایک کا منہ حسرت سے تکتا اور کہتا ”بشر شاہ کی صورت دکھا دو“ طبیعت بد معال اور دنیا خراب ہو گیا۔ قبر کو چھتا۔ تعویذ کو پیا کرتا۔ درختوں سے سر بھوڑتا۔ خاک کو آنکھوں سے لگاتا۔ روتا۔ بلیلاتا۔ چیختا۔ پیٹتا۔ پرندوں سے گڑ گڑاتا۔ بادلوں سے بلتی ہوتا۔ چاند سے خطاب کرتا۔ سورج سے سوال کرتا۔ دن بھر جنگل کی خاک چھانتا اور رات بھر قبرستان میں واویلا مچاتا۔ چند روز میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ جس میں سوائے سانس کے کچھ نہ تھا۔ سرخ و سفید رنگ جھلس کر سیاہ اور ماتھی جیسا ڈیل سوکھ کر کاٹھا ہو گیا :

چار پانچ مہینہ اسی طرح بسر ہوئے اور اب حسن کو یقین ہو گیا کہ جس خدا نے زندگی میں میرا مال مجھ سے جدا کر دیا وہ مرنے کے بعد مجھ سے ملا دیگا۔ دس ہزار روپے کی جائیداد بیوی کو دی باقی تمام اثاثہ مدرسہ کے نام وقف کر دیا۔

حسن کی مصیبت سے شہر بھر کو ہمدردی تھی۔ مگر مصیبت ہی ایسی تھی جس میں سب مجبور و لاچار تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر ہر شخص کو رحم آتا، آدمی اُن کا کیرا ہے۔ غذا ہوتی۔ چار پائی سے لگ گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر وقت بخار رہنے لگا۔ اب اگر آمدنی تھی تو صرف اس جائیداد کی جو شاہدہ کے نام تھی اور یہ کہنا جائز ہوگا کہ میاں سے نا اُمید ہو کر اور یہ سمجھ کر کہ موت ملنے والی اور صحت ملنے والی

نہیں اس نے اس کے علاج پر زیادہ توجہ نہ کی۔ مدرسہ کا وقت شاہدہ کے دل پر دوسرا صدمہ تھا۔ دنیا بدل گئی اور زمانہ پلٹ گیا۔ شاہدہ جیسا لال گہری گور میں جاسویا اور حسن جیسا جوان قبر کے کنارے جا پہنچا مگر نہ فرق آیا تو شاہدہ کے ڈھنگوں اور وطیروں میں وہی کلب کے جلسے وہی ترقی کی دھن۔ اور وہی مذہب سے نفرت حد یہ ہے کہ میاں کے مرض الموت میں بھی اس کی تفریح مانع نہ ہوئی گھنٹوں حسن اکیلا پڑا رہتا اور کوئی اتنا تک میسر نہ ہوتا کہ حلق میں پانی ٹپکا دے! دولی ٹھنڈائی تو تھی ہی نہیں اور تنہا بھی کون جو علاج کرتا۔ لے دیکر ایک بیوی ہی بیوی، اس کا بس چلتا تو شاید دو چار سانس پہلے ہی میاں کو پہنچا دیتی۔ علاج۔ غذا نسکین جو کچھ تھا وہ پانی۔ اس کے بھی لالے پڑ گئے۔ جب بخار نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا تو حسن کی زندگی شاہدہ کو وبال جان ہو گئی (محبوری گھر آجاتی ورنہ زیادہ وقت کلب میں گزار دیتی۔ دوست۔ آشنا جان پہچان آتے اور دیکھ دیکھ کر عبرت پکڑتے حالت ردی ہوتے ہوتے مہانک پہنچی کہ ایک رات بالکل بیہوش پڑا شاہدہ نے سر شام یہ کیفیت دیکھ لی تھی۔ مگر بڑے جوڑھ صبر ہوئی تو آٹھ صبح ہی کو کھلی باس آئی دیکھا۔ پوچھا۔ مگر جب جواب نہ ملا تو اخبار دیکھنے چلی گئی۔ دس بجے کے بعد آئی تو معلوم ہوا کہ حسن کی روح کبھی کی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی ۛ

۲۹ اُسیواں باب

حسن کی موت پر عدت وغیرہ تو جاہلوں کا کام تھا۔ اس لئے شاہدہ نے جائز رکھی ہی نہیں۔ غضب یہ کیا کہ نماز روزہ کے گہیوں یتیموں کو کھانا اور مسکینوں کی خیرات بھی فضول سمجھ کر آزادی۔ آمدنی میں کمی وقعت کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی مگر دل بڑھا ہوا، حوصلے پڑھے ہوئے، سینکڑوں روپے کے مقابلہ میں اب ساٹھ

والا نہ ہوا اور اظہار لال محض اخباروں تک محدود رہے۔ زبان دنیا بھر کے جن کاموں میں گرفتار رہی۔ دماغ زندگی کے جن جھگڑوں میں ابھار لیا۔ اس وقت وہی تصویریں آنکھ کے سامنے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ زبان مکتہ توحید اذکاری اور دماغ مالک حقیقی کے غوف سے تھڑا اٹھتا۔ پتی کے ارد گرد مسلمان عورتیں کلام پاک کی صداؤں میں جو قدامت کا جوہر تھا۔ تم کو دنیا سے ودا ع کرتیں اور بجائے کہاروں کے کندھوں اور گارسی کی پھتوں کے مسلمان شہنشاہ حقیقی کا فرمان پڑھتے ہوئے اپنے پاک کندھوں پر با وضو تمہارا جنازہ لیجائے آجِ ہدایت تم کو ان سب چیزوں سے محدود کرتی ہے۔ مگر اس لئے کہ ابھی دماغ صحیح اندازِ بان کام کے قابل ہے۔ بیٹی سمجھاتی ہوں کہ افلاس کی مصیبتیں، جدائی کے صدمے اور ناکامی کے رنج اس باز پرس کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ تو بہ کرد معافی مانگو۔ رفو اور گڑ گڑاؤ، رحیم ہے کریم ہے۔ شاہدہ کلہ پڑھ اور کہہ۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“

دنیا آج ختم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہاں کی انگلیں اور حسرتیں بھی۔ اب معاملہ اس سے ہے جو حقیقی حاکم اور سچا مالک۔ جہاں پل پل کا حساب اور تل تل کا مواخذہ۔ ماتھ اٹھان ہاتھوں کو جوڑ، یہ وقت آخریہ سانسِ ہمان اور دنیا ختم ہے گواد کر مجھ کو اپنے اسلام کا اور اقرار کر باپ کے سامنے توحید کا، پناہ مانگ اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر اور پتھر اُس روز کے عذاب سے جسکی شام نہیں۔ ما اور باپ جو عاشقِ زارتھے دونوں چھوٹے ہیں اور دنیا اور زندگی جسکی دیوانی رہی آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ابھی وقت باقی اور موتہ موجود ہے۔

ماں میں تک پہنچی تھی کہ شاہدہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے اکیطرن ماتھ جوڑ کر کہا۔

”ہاں موت میرے سر پر پہنچی اور جس چیز کو میں عمر بھر بھولتی رہی اب اس سے
 چھٹکا مارا نہیں۔ اس وقت بھی کہ اذیت کے مارے جان نکل رہی ہے اور تکلیف نے
 جان پر بنا رکھی ہے جہاں اپنی بہت سی غلطیوں پر نادم ہوں وہاں نہایت
 ادب سے عرض کر دیتی کہ مجھے اب بھی آپ کی بعض باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔
 دنیا اچھے اور بُرے، فرمانبردار اور گنہگار بندوں سے بھری پڑی ہو۔ اس دنیا نے مجھ کو
 بھی زیادہ گنہگار عہد توں کو دھکے دے کر نکالا ہے۔ بینک میں رو سیوا ہوں اور
 میری زندگی بانیوں سے تنہا رہی ہوئی ہے لیکن خدا نے اپنے رحم و کرم سے بڑے
 بڑے سرکشوں کا بڑا پار کیا ہے۔ اسی کے فضل کی توقع مجھے بھی ہے۔ آپ کے
 خیالات آپ کی زندگی آپ کی تلقین امت مرحومہ کے لئے بہت کچھ مفید اور میں خدا
 کو شاکر کرتے ہوئے کہتی ہوں کہ آپ کا وجود اگر مسلمانوں کے واسطے نہیں تو اسلام
 کے واسطے بلا غنیمت ہے۔ لیکن وہی خدا جس کو میں گواہ کر رہی ہوں اچھی طرح جانتا
 ہے کہ میں اس وقت بھی اس راتے پر صداقت سے قائم ہوں کہ قدامت دورِ حاضر
 میں اصلاح کی محتاج ہے۔ اور اگر آپ جیسی محترم خواتین اس طرف توجہ فرما کر قدامت
 اور جدت کو نکلے لو ادیں تو قوم اور مذہب دونوں پر ایک بڑا احسان ہوگا۔ اما جان!
 باوجود ان تمام عیوب کے جو جدت میں موجود ہیں یہ بلا ملنے والی نہیں اور اب مسلمانوں کے
 واسطے سوا اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ وقت کا ساتھ دیں اور اپنے آبائی جوہرِ حکو
 مجھ بد نصیب نے ہمیشہ ٹھکرایا محفوظ رکھیں اور مذہب کو اپنا جزوِ اعظم قرار دیں۔

میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے بعد دنیا کی ہر خوشی اور زندگی کی ہر سرتست آپ کے
 زخم پر کچے ہوگی اور میری موت آپ کی زندگی کو مردہ کر دیگی۔ لیکن میں آپ سے التجا کرتی ہوں
 کہ جو کچھ میں چھوڑ رہی ہوں اس میں سے نصف مدرسہ کیا سطرے وقف ہے آپ کو خوش نشین رہنا
 کہ ہر مدرسہ سے ایسی لڑکیاں نکلیں جو سوتی ہوئی قدامت کے نمونے ہوں اور اسلام

کی برکتیں اُن کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوں۔

کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شاہدہ نے پھر کہنا شروع کیا :-

”آپ نے مجھے ایسین سٹائی مگر میری روح اس وقت تک پرواز

نہ کرے گی جب تک میں اپنے جرائم کی سزا کا پورا مقابلہ نہ کروں

اور جب تک دنیا کے طاقتور اچھی طرح نہ دیکھ لیں کہ کمزروں پرستم

توڑنے والے ظالم کو کس طرح موت آتی ہے۔ میں اب بھی یہ کہتی ہوں

کہ مجھے حقوق اللہ کا زیادہ اندیشہ نہیں ہے۔ میں خدا کی کمزور لاچار

مخلوق جو میرے ہاتھوں تاراج و تباہ ہوئی یقیناً مجھ سے بدلہ لے گی

اور بے رہی ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے سچی ہمدردی ہے تو منیر اور چچا

کو بلائیے۔ میں اُن سے اپنے مظالم کی معافی مانگوں اور بقیہ نصف

وقف ان کی خدمت میں پیش کروں کہ ان کی دعائیں میری اذیت

کا خاتمہ کریں۔

اما جان خدا را جلدی کیجئے میرا دم بکھتا ہے۔ اور رکتا ہے۔

ایک تکلیف ہو تو کہوں۔ یہ جسم جیتے ہی جی آگ میں بھن رہا ہے۔

عقل اس کو بخار کہہ کر مطمئن ہو جائے۔ مذہب اس کو عذاب بتا چکا

درد اور کسک کی موجیں ہیں کہ بدن کے ہر حصہ سے اُٹھ رہی ہیں۔

”ہائے کیا کروں“

شاہدہ اسی طرح ٹرپ رہی تھی کہ زاہدہ رچیٹا اور منیر اُگلے کمراندہ داخل

ہوئی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی ماں ہاتھ جوڑتی ہوئی اُٹھی تو رچیٹا نے رو کر کہا۔

”بگیم! مجھے کیوں گنہگار کرتی ہو۔ ماں نے پھر ہاتھ جوڑے اور کہا۔

”زندگی کی نخواست اور خودداری کے جھوٹے گھنڈے جو آجکل کی لڑکیوں کا شیوہ

ہو گیا ہے۔ بد نصیب شاہدہ کی آنکھوں پر پردے ڈال دے۔ اور اس نے وہ حرکتیں کیں جو موت کے دروازہ پر قصرِ زندگی کے بسنے والوں کے واسطے سبق ہیں۔ میں تم سے اور بوا منیرؒ سے بہ منت التجا کرتی ہوں کہ اس کا قصہ مرعوف کر دو۔ اپنی غلطیوں کی پاداش میں یہ اپنی آدمی جاؤ تمہاری خدمت میں پہن کرتی ہے۔ یہ دستاویز قبول کرو اور دعا کرو کہ خدائے وحدہ لا شریک اس پر رحم کرے۔ موت کی سختی اور قبر کا عذاب اس پر آسان ہو اور قیامت کے مواخذہ سے محفوظ رہے“

اس وقت شاہدہ نے دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے اس کی روتی ہوئی آنکھیں زحمت سے جھکیں اور اتنا کہہ سکی۔

”خدا را میری خطا سے درگزر کیجئے“

رحیمیا کی بھی ہچکی بندھ گئی تھی اُس نے شاہدہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر

کہا :-

”بیگم خدا تمہاری ماما ٹھنڈی رکھے اور شاہدہ بیوی کی عمر میں بکت دے۔ مجھے زاہدہ بیوی رستہ بھر ہی سمجھاتی لائی ہیں۔ میں اس وقت پرانے جھگڑے نہیں چھیڑتی۔ میں نے دل و جان سے معاف کیا۔ خدا معاف کرے“

اتنا سنتے ہی شاہدہ کے منہ کی زردی اطمینان کی ایک خفیف سی سرخی میں تبدیل ہوئی۔ اُس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور دل ہی دل میں جو کچھ کہا وہ صرف ہونٹوں کی حرکت سے ظاہر ہوا، مگر الفاظ سمجھ میں نہ آ سکے۔

کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر بائیں خاموش ہو گئی پھر،

زادہ کو اشارے سے قریب بلایا، گلے لگایا اور آہستہ سے کہا،

”میرا یہ پیام مسلمان لڑکیوں تک پہنچا دینا۔“

”تعلیم جدید کے خبط نے میری دنیا اور زندگی کو برباد کر دیا۔ ضرورت تھی

کہ دنیا میرے واسطے جنت اور زندگی دوسروں کے واسطے راحت ہوتی

مگر میرے یہ دونوں جوہر غارت ہوئے۔۔۔

اب میری دنیا ختم ہو رہی ہے اور اصلاح اور احتیاط تو درکنار

وہ وقت ہے کہ بچتا بھی نہیں سکتی۔ افسوس بات نہیں کی جاتی

سر وہ چیز جسے اپنا سمجھ رہی تھی۔ مجھ سے آنکھیں بدل گئی۔ یہاں تک

جسدِ خاکی کے اعضا بھی بے وفائی کر رہے ہیں اور سب نے مجھ سے منہ موڑ

لیا۔۔۔ ہم مسلمان لڑکیوں کو یہ الفاظ پہنچا دینے کی ذمہ دار ہو کر مسلمان

لڑکیاں اگر دنیا میں کامیاب ہو سکتی ہیں تو صرف مذہب کے سایہ میں جس

گھرنے جس لڑکی نے مذہب کو ٹھکرایا وہ یاد رکھے کہ دنیا اس کو کتے کی مورت

مارے گی..... مائے زاہدہ کیا کروں بات نہیں کی جاتی.....

اسکے بعدڑک مڑک کر شاہدہ کجہ اور باتیں جو اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکتی

تھیں کر رہی تھی کہ روز روشن کی دواغ کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئی۔

تخم

مصوغم حضرت علامہ راشد خیر می طلہ العالی کی مشہور مقبول تصانیف

طوفان حیات

جس نے ایک دنیا میں دھوم مچا دی تھی جس کی تعریف میں اخبارات و طبیب اللسان تھے جس کا استقبال اردو علم ادب نے نہایت شاندار کیا تھا کئی کئی سال سے ناپید تھی اور ہزاروں شائقین اس کے مطالعہ کے لئے بیچیں تھے۔ اب عالم نسواں میں نہایت مسرت کے ساتھ سنا یا جائیگا کہ طوفان حیات پھر چھپکر تیار ہے قبیح رسوم اور شرک و دعوت مسلمانوں کو غم کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکے ہیں، مشکل سے کوئی گھر ہوگا جہاں ان لغویات کا گذر نہ ہو، اس کتاب کی ہیر و من مشرکہ کی زندگی اس قدر عجیب ہے کہ پڑھنے والا حیران ہو جاتا ہے۔ وہ رسوم جنہوں نے مسلمانوں کا خاکہ اڑا دیا اس وضاحت اور خوبی سے بیان کی گئی ہے کہ پڑھنے کے بعد گھر میں ایسی رسموں کا نشان باقی نہیں رہتا، شرک جو دنیا کے نسواں پر عام طور سے قابض ہے طوفان حیات کے مطالعہ سے کوسوں دور بھاگ جاتا ہے اور رسوم مروجہ خوفناک آوازوں کی صورت میں نظر آنے لگتی ہیں اور انسان خلیق واحد کی عظمت کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ قصہ کی دلچسپی، زبان کی سلاست کے متعلق کچھ کہنا فضول ہوگا۔ واقعات اس قدر دل انگیز کہ سچے بندہ جاتی ہے۔ اعلیٰ کاغذ پر بہت عمدہ چھاپی گئی ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

جھوٹے چھوٹے نہایت لطیف ادبی جھوٹے مضامین کا دلآویز مجموعہ جذباتی سوالی کی درگاہ پر تالیف ہے۔ ان مضامین میں علامہ محترم نے شاعری کی سادہ و سلیس نمائندگی یہ کتاب بہترین نمونہ ہے جو اردو میں پیش کی گئی طرز تحریر اپنا پایاں لگا کر بار بار پڑھے پھر بھی جی نہ بھرے ایک ایک فقرہ حفظ کر کے کوئی چاہتا ہے نصرت ہر بار رسوم

حیات صا کھ

یا صا لحات علامہ محترم کی سب سے پہلی تصنیف جس نے جادو نگار مصنف کے کمال افسانہ نگاری کا اندازہ بھر میں دینا چاہو بھلا تھا اس میں ایک نیک لڑکی کی زندگی کے وہ تمام واقعات نہایت ہی مؤثر و پرانیہ میں بیان کئے گئے ہیں جو اکثر ہندوستانی گھروں میں پیش آتے ہیں۔ صا کا تہ سے معلوم ہوگا کہ وہی باپ جو اولاد کا عاشق زار ہے، کس طرح بچوں کی جان کا دشمن اور خون کا پیاسا مرجان ہو، صا کا تہ بتائیگی کہ چاہل مڈھلی ماں کس طرح سوگن کے بچوں کی مٹھی باندھ کر رہی ہے صا کا تہ سے معلوم ہوگا کہ نیک لوگ کی لڑکیاں مصائب کا کیسے کیسے ریتار اور قربانیوں سے مقابلہ کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں قصہ کے ضمن میں آج سے چالیس پہلے کے گھرانوں کی معاشرت، رسم و رواج وغیرہ نہایت دلچسپ طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ طرز تحریر کیا کہنا۔ زبان دی قلمبندی کی ہنگامی، اکثر سے گوی ہوئی واقعات اس قدر مؤثر کہ کلیجہ کے پار ہوتے ہیں، ہندوستانی زبانوں میں متواتر کے مطلب کے اس قدر بلند معاشرتی ماحول بہت ہی کم ملے گئے ہیں۔

ملک کے مشہور افسانہ پرداز اور نقاد مولوی ظفر صاحب ام اے ایل ایل بی حیات صا کھ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "سیرت نگاری میں مولانا نے کمال کر دیا ہے۔ اس پہلی ہی کتاب میں مولانا نے قلم نوڑ دیا ہے۔ کتاب کیا ہے ایک قیاس ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔" صرف سترہ میں اس کی ہزارا جلدیں ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں پورے دو سو صفحات ہیں قیمت پھر

بندیہ ہے،
منبر عصمت دہلی

نوحہ زندگی

غیرت دار خاتون اپنے دونوں بچوں کو لیکر ہونڈ خاک موگنی گاؤ دنیا آج تک اس بد نصیب ہستی کا حکم کر رہی ہے جو خشت کے نام سے دنیا میں پیدا ہوئی اس کی آؤ کا دواں عالم بالا پر دواں دھار گھٹلون کر پہنچا فرشتوں نے اس کا آواز برصدا سے لیکر بلند کی اور آسمانی کائنات کا ذرہ ذرہ لمبلا کر رب العزت کی بارگاہ میں استقامت کا طبعی ہوا۔ وہ سنگدل باب جس نے اصل نسل مغلائی اور اس خاندان کی لوہی کو جس کا آئینل تک فرشتوں کو دیکھنا نصیب نہ ہوا بھروسے بچوں میں اس گناہ پر کھاج ثانی کیا عدالت تک گھسیٹ کر جیلخانہ پہنچا دیا۔ باغ باغ ہے وہ پھر ہاں جس نے نو مہینے پیٹ میں رکھنے اور تیرہ برس بدوشی کرنے کے بعد معصوم اور ملیکا دیکھی کو یہ دیکھ کر کھاج ثانی کے جرم میں بے خطا اور بے قصور کو قید کی مصیبتیں جھیل رہی ہے نہال نہال ہے، ورنہ دروہیں نظام دنیا کے سلسلہ میں غلاب قید سے مردوں کے قریب پہنچ جاتی تھیں کہ نظام قدرت اپنا ہاتھ بلند کرنا ہے اور کیا کرنا؟ اسکا جواب اس کتاب میں ملیگا جو علامہ رانا جی صاحب کی بے مثل کتاب نوحہ زندگی ہے۔ یہاں آپ کو ایک ایرافہستان ملیگا جس میں ایک بصمتی خال لائی رکھنے والی بیوی اور غیرت پر قربان ہونیوالی ماں، بچے و بھروسہ بچوں کو دایں ایمن سے گہری میند سوری ہے۔ کتاب نہیں ایک جادو ہے جسکا ہر لفظ مرتبہ ہے اور یہ حق رکھتا ہے کہ مسلمان ایک دفعہ اسکو پڑھے اور سمجھ لے۔ بیوہ اور اس کی زندگی نے اسلام میں کیا صورت اختیار کی، نوحہ زندگی باطل پرستوں کو حق پرستی کا سبق سکھائیگی اور مسلمانوں کو بتائے گی کہ ایک مسلمان کسے رخصت و رواج نہیں۔

نوحہ زندگی سب سے بڑی چیز ہے۔ آٹھواں ایڈیشن ہے نوحہ زندگی علامہ راشد بخاری تہذیبی اپنی برصغیر میں غربت کا شہسخت

جینٹیل دکھائی ہیں مگر اس کتاب میں خصوصیت کس اتھماں بیوی، امیٹی، اہمیت کی ہر حیثیت علیحدہ علیحدہ دکھائی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ ہر حیثیت میں عورت ایسا اب انبار اور قربانی کر دکھاتی ہے کہ مرد حیرت میں رہ جاتا ہے، نسوانی بگاڑ کا ہر افسانہ بے انتہا دلچسپ ہونے کے ساتھ سبق آموز اور دردناک سے لبریز ہے ایک ایک سطر لکھنے کے بارہ مہینے قیمت صرف ۱۰ روپے صرف ایک افسانہ ہی پڑھ کر وصول ہو جاتی ہے مسلمان جہاں اور احکام آئی سے

موقوفہ

ہزاروں کو س دور جا پڑے ہیں، اسی طرح لڑکیوں کی پیدائش میں بھی وہ اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ قوت بہانہ تک پہنچ گئی ہے کہ شریعت اسلام کا فیصلہ پیش کرتی ہے مگر مسلمان لڑکیوں کو کلام الہی کے خلاف ترکہ پوری سے مجروح کر کے رواج کو ترجیح دیتے ہیں۔ علامہ محترم نے یہ کتاب اسی خزانے کے اندر اور لکھی اور حق یہ ہے کہ بہت خوب لکھی اور ایسے دوسرے لوگ اس سے کہ پھر سے پھر لکھی اور اس کو پڑھ کر کہتے ہی نہیں بلکہ موم ہو جاتے ہیں۔ قصہ اس قدر دلچسپ کہ بغیر حتم کئے نہ چھوڑا جائے قیمت ۸

انگوٹھی کا راز

بعد ازین حضرت مصنف نے نظر ثانی اور بہت کچھ اضافہ کر کے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ۳ مختلف ایڈیشن لڑکیوں کا حق آموز افسانہ ہے۔ رابعہ کا عبرت انگیز انجام اسلامی کی جگر خراش داستان اور مصنف کی مشکلات، انگوٹھی کا راز اس خوبی سے حل کرتا ہے کہ پڑھنے والے محو حیرت ہو جائیں۔ قیمت ۸

بچہ کا کرتہ

ایک عاشق زار بد نصیب ماں بچہ جو ان بچہ کی بدولت وہ مصیبتیں اٹھاتی ہے کہ کلچر منہ کو آہ و دناں کی نجات اور اپنا کادہ عبرت انگیز جواب دیتی ہے کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ بہت مؤثر فسانہ ہے اور کئی ماں دلچسپ ہو جاتی ہے ۸

جوہر عصمت

۱۳۔ سبق آموز افسانے (۱) مظلوم بیوی کا پاک بندہ
عرفان ایک معزز اور شریف خاندان کا شخص بری صحبت
کی وجہ سے لاکھ لاکھ جاک کر کے جیل خانہ پہنچنے والا ہوا
کہ مظلوم بیوی کی کوششوں سے اس طرح رہائی
حاصل کرتا ہے کہ پڑھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔
(۲) بھنڈو کی دلہن - بلوچی قوم کے مرد و عورت کے
عین کی طرح ازدواج ثانی پر نہایت مؤثر بحث، محبت
کا جواب اور انتقام بے ابتدا و لاؤ افسانہ (۳) انگلی
بھیتیں - ہزاروں برس پہلے کے تمدن کا ایک عجیب
مربع، شجاعت و جان نثاری دوستی و مفاد داری اور سچی
محبت کے حیرت انگیز مناظر۔ (۴) فیاض تیرہ لکھ نمبر
کی درد عم بھری کہانی (۵) بگناہ کا قتل مغیرہ کی شرارت
اور انتقام امیر کی بدلتا کی اور سنگدلی اور محبت کی جو کٹ
پر کرمان لڑائی کی قربانی (۶) بھاری کینہ - دولت
و عصمت کا مقابلہ (۷) ماموں رشید کا دربار اور ایک
سچی عورت (۸) عدل جہا نکیری - شہنشاہ جہانگیر
کے انسان کا دل دلاؤ دینے والا واقعہ (۹) بیل کی شہادت
(۱۰) ملکہ شہزاد ملکہ طرہیں اور بادشاہ کا افتراق لکھ کا
عصمت کی کوئی پرورد اترانا (۱۱) بے رحم کی سختی - خدا کی
بے آواز (۱۲) غلط فہمی نہایت مؤثر قصہ (۱۳) خانہ
بائیں - ان ۱۳ افسانوں کا مجموعہ
جی ہر عصمت ہر شریف مرد اور
شریف عورت کی نظر سے گزرتا جائے۔ بہت
مشہور و مقبول ہے۔ ایسا چھٹی مرتبہ شائع
ہوا ہے۔ قیمت
پیم
موصول ڈاک بزم خرمیاد۔

نوبت پخیزوہ

شہنشاہان آباد و جھکا کر
اُس کے کھنڈر اب تک
ٹٹے والوں کے کانٹے سارے ہیں اور شہر کے درو دیار
اسوقت بھی اپنے جہازوں کا مزید پڑھ رہے ہیں آج سے
ستر سال پہلے دلی کا تھی بادشاہ کا جلوس قلعہ معلیٰ کی بار
شاہی جنگل سے پہلے تماشوں کے رنگ، دربار کی کیفیت،
قلعہ صاحب کے مقبے، چتر عیب، شاہ بڑے اور کلمہ
کے جن، شہر آبادی کی چل چل ہیں۔ ہندو مسلمانوں کی معاشر
رمضان، عید، اسکوڑا سا لکڑے کے ترک و اختتام
شادی بیاہ کے رسوم۔ غرض در گذشتہ کی ہمارا گر
دیکھیں تو نوبت پخیزوہ یعنی (۱) اس خطفہ لا منظوم
جس میں آخری اجاد مغلیہ کی باغ و تہیں اسقدر در آگئے
پیرایہ میں لکھی گئی ہیں کہ غرض کے اسکوڑا دیں گی۔ پخیزوہ
نوبت وہ ہے جب دلی نے بادشاہ کو وداع کیا غرض
کے واقعات، مخبروں کا ظلم، مظلوموں کی حالت ناز
مردوں کی ریادہ، عورتوں کی تباہی اور بادشاہ کے ہم
مصائب نامک ہے کہ آب انوہا سے بغیر پڑھ سکیں
بادشاہ کی تصویر اور تین اور غلطی تصویریں بھی دی گئی ہیں،
نوبت پخیزوہ دور حاضر کے مایہ ناز اردو مصنف کی
بہترین تصنیف ہے۔ اور دھڑا دھڑا کر رہی ہے۔
تیسرا اڈیشن بھی ختم کے قریب ہے قیمت پیم
قسم اعلیٰ غیر جلد پیم جلد ہے

نفس اعلیٰ غیر جلد پیم جلد ہے

غدر کی ماری شہزادیاں یعنی

بیلے میں میلہ
غدر کی ماری خیز دیوں کی آپ بیتی وہ دل ہلا دینے والی
کہانیاں کہ بدن کے روندنے کھڑے ہو جائیں! دو سال تک
رسالہ عصمت میں چھپ کر ان کی مجموعہ بھی ہے بین چاروں کی
رنگ کی بال کی خوبصورت تصاویر زکریا خیر کے رنگینی
گئی ہیں قیمت ۱۲۔ وداع ظفر بھی انکے ساتھ لگانے

ملک عصمت دہلی

